سفینۂ ادب کا ترجمان

دو ماہی رسالہ

سفینہ

شمارہ ۱۰۹

جنوری ——— اپریل سنہ ۱۹۸۴ء

کلیم الدین احمد نمبر

مدیر

عطا کاکوی

قیمت:- ۶ روپے   Rs. 6/-

سال بھر کے پرچے مجلد -/25

ملنے کا پتہ:- گل مہر پبلشنگ بک ہاؤس، سبزی باغ پٹنہ ۴

113366
16 3 89

فہرست

معیار نظر: ارشد کاکوی مرحوم کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آرہا ہے۔ "ناشر"

معروضات

۱۹۸۴ء ختم ہونے کو ابھی دس دن باقی تھے مگر کیا علوم تھا کہ قضا و قدر کے ترکش میں ایک دل دوز تیر اردو زبان و ادب کے سینے میں اگر یکایک ترازو ہو جائیگا جس نے ساٹھ سال تک علم و ادب کی آبیاری کی اور اپنی ان تھک کوششوں سے نخل اردو کی مختلف شاخوں کو سرسبز و شاداب کرتا رہا یکایک اس دنیائے آب و گل سے منہ موڑ لے گا اور منوں مٹی کے تلے یہ گنج علم و دانش شہر خموشاں میں ابدی نیند سو رہے گا۔

کلیم الدین احمد اپنی نظیر آپ تھے، زبان خموش تھی قلم گویا تھا۔ سنتے سب کی تھے، کرتے وہی جو ان کا ضمیر کہتا۔ نہ کسی سے بہت خلا ملا نہ کسی سے لگی لپٹی کتابیں ان کی رفیق، قلم ان کا ہمدم، محنت ان کا وتیرہ، خودداری ان کا شیوہ بے جھجک، نڈر، صاف گو، صاف دل اور صحیح معنوں میں "انسان"۔ ان کی میت زبان خموش سے کہہ رہی ہے کہ

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

لوگوں نے ان کے متعلق کیا کیا کہا انہوں نے لوگوں کے متعلق کیا کہا

وہ خود اپنی نظر میں کیا تھے۔ یہ سب کچھ آپ کو اس شمارے کے اوراق میں
کما حقہٗ ملیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات اور ان کی تصانیف و تالیفات
کا بھی ایک مختصر جائزہ آپ کو انہی اوراق میں مل جائے گا۔ یہ دریا کے چند
قطرے ہیں۔ سمندر کو کوزے میں بند کیا گیا ہے، سفینہ کی تنگ دامانی کا گلہ
ہے۔ حسنِ کمال کی گل چینی کیا ہوگی۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچیں "کمال" تو ز داماں گلہ دارد

دو سال تک سفینہ سہ ماہی رہا۔ اس کی سست رفتاری شائقین کے
لئے صبر آزما ثابت ہوئی۔ کرنے کو تو سال رواں سے اسکو دو ماہی کر دیا گیا
ہے۔ اور دل کی خواہش ہے کہ اس کو ماہنامہ کر دیا جائے گا۔ مگر اس کے
سامنے ایک زبردست مگر سدِ راہ ہے، اس مشکل کا حل کرنا میرے
بس کی بات نہیں۔ قارئین اور شائقین اگر چاہیں تو آسانی سے اس
سفینہ کی بادبانی کر سکتے ہیں۔ موجیں حائل ہیں، بھنور منہ کھولے ہوئے ہے
سفینہ کا خدا نا خدا ہے۔ وہی پار لگائے گا۔

---

۲۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ایک عظیم اور منفرد نقاد کی موت کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ بس
ایک ہی ماہ کے بعد ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو بہار ہی نہیں بلکہ برصغیر کا ایک بے بہا
محقق بھی چل بسا۔ قاضی عبدالودود کی موت ایک فرد واحد کی موت نہیں بلکہ یہ
کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ علم و دانش کا، فضل و کمال کا، تحقیق و تفتیش کا

ایک بلند ستون گر گیا۔ کلیم سالقا داور قاضی عبدالودود جیسا محقق دونوں کے دونوں کا آگے پیچھے انتقال کر جانا اردو زبان و ادب کا عظیم ترین سانحہ ہے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

قاضی عبدالودود ہی کی زندگی میں معاصر نے ایک خاص نمبر نکال کر ان کی علمی، ادبی، ثقافتی، تحقیقی اور سماجی زندگی کا مکمل مرقع شائع کیا تھا۔ سفینہ قارئین سے اسکے مطالعہ کی سفارش کرتا ہے۔ اسلئے کہ سفینہ ان کے حالات پر مزید کوئی اضافہ کرنے سے اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہے۔ قاضی صاحب نے ادارہ تحقیقات اردو کی بنا ڈالی تھی۔ قوم کا فرض ہے کہ اس کی بقا کیلئے مستعدی کے ساتھ آمادہ ہو جائے کہ یہی بڑی یادگار قاضی صاحب — کارناموں کو زندہ رکھنے کیلئے ہوگی۔

سال رواں کی پہلی ہی سہ ماہی کا ایک اور ادبی حادثہ اردو زبان کیلئے المناک ثابت ہوا اور وہ ہے ساغر نظامی کی وفات حسرت آیات — ساغر نظامی سیمابی سلسلے کے خوش فکر، خوش لہجہ اور خوش گو شاعر تھے۔ اپنی پاٹ دار آواز اور پرترنم نغمات سے محفل شعر و ادب کو نصف صدی تک پر رونق بنائے رکھا۔ حکومت نے بھی بزراہ قدر دانی پدم بھوشن کے غیر شاعرانہ خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ زبان اردو اب ان کے سحر آفریں نغمات سے محروم ہو گئی۔

موجودہ شمارہ کلیم الدین احمد نمبر کے طور پر شائع ہوا ہے۔ اسی کا

شمارہ نمبر ۹، ۱۰ ہے۔ اور یہ دو اشاعتوں کو محیط ہے۔ آئندہ شمارہ گیارہواں نمبر ہوگا۔ چوں کہ اب اس کی اشاعت دو ماہی ہو گئی ہے۔ اسلئے اسکی قیمت فی شمارہ تین روپے رکھی گئی ہے۔ سال میں چھ شمارے انشاءاللہ پابندی کے ساتھ نکلتے رہیں گے۔ الگ الگ یہ شمارے دستیاب ہوتے رہیں گے ساتھ ساتھ، سال کے اختتام پر سال بھر کے شمارے یکجا مجلد بھی دستیاب ہو سکیں گے جسکی قیمت بیس روپے ہوگی۔ دو سال تک خاموش خدمت ادب کے صلے میں کیا یہ توقع نہ کی جائے کہ قارئین اس کی سالانہ خریداری کی طرف بھی نظر التفات کریں کیونکہ اسکی بقا انہی کے دامن توجہ سے وابستہ ہے۔

مدیر سفینہ کی ایک کتاب بنام "غلطیہائے مضامین" حال ہی میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو بالاقساط "معاصر" جیسے معتبر رسالے میں شائع ہوتے رہے اور بہ نظر استحسان دیکھے گئے۔ اس کی قیمت یوں تو پندرہ روپے ہے مگر سفینہ کے مستقل خریداروں کو دس روپے میں دستیاب ہو سکتی ہے۔

مدیر

کلیم الدین احمد ایک نظر میں

کلیم الدین احمد کی پیدائش اپنے آبائی مکان واقع محلہ خواجہ کلاں پٹنہ سیٹی میں ۱۵؍ستمبر ۱۹۰۸ء کو ہوئی، لیکن تعلیمی رکارڈ میں اندراج ۱۹۰۹ء کا ہوا۔ انسان کی پوری زندگی میں یوں تو ایک سال کے فرق سے کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا، صرف اتنا ہوا کہ عمر میں ایک سال کی کمی اور مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع ہو گئی۔ ابتدائی تعلیم رسمی طور پر گھر ہی پر ہوئی۔ پھر محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی میں داخلہ ہوا اور وہاں سے ۱۹۲۴ء میں میٹریکولیشن سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا جس سے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچی اور پھر کتابوں میں اتنا مستغرق ہوئے کہ مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا جس کا نتیجہ حسب خواہ ہوا۔ نیو کالج سے آئی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں، پٹنہ کالج سے بی۔ اے آنرز، اور ایم۔ اے (انگریزی) علی الترتیب ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں درجہ اول میں اول آئے۔ گورنمنٹ سے وظیفہ پاکر ولایت مزید تعلیم کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں کیمبرج سے اعلیٰ سندیں حاصل کر کے ۱۹۳۳ء میں لوٹے۔ فوراً ہی پٹنہ کالج میں لکچرر ہوئے۔ ڈی۔ پی۔ آئی کے عہدے پر سرفراز رہے بھاگلپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے اور سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے چیرمین بھی رہے۔ محنت کی جو عادت پڑھنے کے وقت سے

تھی وہ مرتے دم تک رہی۔ کام سے تھکتے نہ تھے اس لئے کام بھی ان کا پیچھا چھوڑتا نہ تھا۔ ترقی اردو بورڈ کے زیر عمل انگریزی اردو لغت کی تدوین کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اس کی پانچ جلدیں مدت معینہ پر مرتب کیں جو اشاعت کی منتظر رہیں۔ پھر دوسرا پروجیکٹ بھی اردو انگریزی لغت کا زیر ترتیب تھا، کہ قضا نے اسکی تکمیل کی مہلت نہ دی۔
آخری وقتوں میں بہار اردو اکادمی میں بہ حیثیت وائس پریسیڈنٹ اپنے فرائض میں منہمک تھے ہی کہ یکایک ہوائے اجل نے اس شمع علم وادب کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا۔
تصنیف و تالیف کا ایک انبار لگا دیا۔ قوم اور حکومت نے بھی ان کے علمی کارناموں کو سراہا، میرا وارڈ لکھنؤ سے اور غالب اوارڈ دہلی سے ملا۔ حکومت نے بھی از راہ قدر دانی ایک غیر ادبی خطاب "پدم شری" سے نوازا۔

تصانیف و تالیفات

مقدمہ گل نغمہ اردو ادب کی دنیا میں سب سے پہلی تحریر جس نے سب کو چونکا دیا کلیم الدین احمد کا یہ مقدمہ تھا جو انہوں نے اپنے والد ماجد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے مجموعہ کلام "گل نغمہ" پر لکھا۔ یہ اگرچہ ابتدائی تحریر تھی مگر غزل شاعری پر برق بن کر گری شعرائے پیشین کے سارے کارناموں پر پانی پھیر دیا گیا اور "گل نغمہ" کو اردو شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز قرار دیا گیا۔ اسے بڑی داد دی ہوئی اور تو وہ قاضی عبدالودود جیسے محقق نے انکے بانکپن جوڑ دی وہ قابل

تو وجہ ہے ——— "ان پر یہ اعتراض ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے والد کو
بہ حیثیت شاعر بہت بڑھا کر دکھایا ہے۔ اسکی ذمہ دار عقیدت مندی
ہے، آوازہ گری نہیں۔"

خود راقم الحروف سے پروفیسر فضل الرحمن مرحوم نے (جو اپنے وقت
کے علم و دانش کے پیکر مجسم تھے) اس سے بھی تذکرہ کیا تھا کہ "کلیم" کرنے کو لاکھ کچھ
کریں مگر وہ اپنے اس مقدمہ کو کیا کریں گے جو انہوں نے "گل نغمہ" پر لکھا ہے۔
"اردو شاعری پر ایک نظر" گل نغمہ پر جو مقدمہ لکھا تھا اس کو تو عقیدت
مندی پر محمول کیا جا سکتا ہے مگر اردو
شاعری پر جو نظر ڈالی گئی ہے وہ حقیقتاً ایک ہی نظر ہے۔ جس سے سب
شاعروں کو پرکھا گیا ہے۔ اور وہ نظر مشرقی نہیں بلکہ مغربی ہے۔ اردو
شاعری کے دیگر اصناف سے تو خیر اتنی بیزاری کا اظہار نہیں ہوا مگر ہماری
غزل کی بڑی درگت بنی۔ یہ نیم وحشی صنف شاعری قرار دی گئی۔ غزل گو
شعراء وحشت زدہ ہوئے، چراغ پا ہوئے۔ تنقید کے پتھروں سے غزل
کا جسم لہو لہان ہو گیا۔ مگر واہ رے اس کی رعنائی، اس کا حسن شباب جیسا
تھا ویسا ہی رہا۔ اس کی سرخروئی میں کوئی فرق نہ آیا۔

سنگِ تنقید سے ہے تن زخمی
اس پہ بھی کتنی سرخرو ہے غزل

اور یہ شعر بھی اس پر صادق آتا ہے۔

شکستِ رنگ شباب و ہنوز رعنائی
دراں دیار کہ آزادی ہنوز آنجائی

ہر ملک کا ماحول جدا ہے، معاشرہ جدا ہے۔ سوچنے سمجھنے کا انداز جدا ہے۔ سارے فنون لطیفہ کو اگر مغرب کے سانچے میں رکھ کر پرکھا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بانسری کی سریلی آواز پیانو کے مقابلہ میں ہیچ اور "ونڈسر پیلس" کے مقابلہ میں "تاج محل" ایک بوچ عمارت متصور ہوگی۔

بہر حال، یہ کتاب بار بار چھپی اور غور و فکر کرنے کا ایک نیا باب کھلا۔ لہجہ تلخ تو ہے مگر تلخ دوا صحت بخش بھی ہوتی ہے۔

اردو تنقید پر ایک نظر | اس کتاب کی اشاعت نے وہی کام کیا جو آگ پر تیل چھڑکنے کا انجام ہوتا ہے

اردو تنقید کا وجود فرضی تصور کیا گیا۔ اور معشوق کی معدوم کمر سے تشبیہ دی گئی، پھر مغربی خوردبین سے اس کا وجود تو ملا مگر بال سے زیادہ باریک۔ پھر اس بال کی کھال کھینچی گئی۔ اس مسلخ میں فربہ اور لاغر ہر طرح کے تنقید نگار کشتنی قرار دیئے گئے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک معرکتہ الآرا کتاب تصور کی گئی، اور کی جاتی رہے گی۔ حالی، شبلی کا منہ تک رہے ہیں تو سرور، احتشام کا، بجنوری منہ چھپائے پھر رہے ہیں تو مجنوں وحشت زدہ۔ لیلائے تنقید کے سبھی عشاق پکار اٹھے ؎ اے عندلیبو آؤ کریں آہ و زاریاں

لیلائے نقد کی کریں ماتم گساریاں

اردو زبان اور فن داستان گوئی | یہ چوتھی کتاب تھی جس نے اردو دنیا کو ایک بار پھر چونکایا۔ اس کتاب میں جناب کلیم سراپا مشرقی لبادہ اوڑھ کر میدان تنقید میں آئے ہیں۔ لوگوں کو حیرت ہے کہ یہ کھچڑی کیسی؟ داستان اور وہ بھی طلسم

ہوش ربا اور بوستان خیال جیسی طویل داستانیں جو تہذیب دور انحطاط کی پیداوار ہیں اور جب ان کا مطالعہ کو کتاب کا خوگر بنا دیتا ہے کس طرح ایک مغربی عینک سے دیکھنے والے نقاد کی آنکھوں میں کھٹک گیا۔ انھوں نے داستانوں کو شاہانہ دسترخوان سے تعبیر کیا ہے جس پر انواع و اقسام کے ماکولات و مشروبات چنے گئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جب معدہ اتنا قوی نہ ہو کہ ان مرغن غذا کو ہضم کیا جا سکے تو پھر ایسی غذا کی افادیت کیا۔ موجودہ دور کے افسانے اور ناول ان داستانوں کے مقابلے میں ان کی نظر میں ہیچ ہیں۔ یا للعجب!!

عملی تنقید تنقید کے اصول بیان کرنے کے بعد کلیم الدین احمد نے ان پر عمل جراحی کر کے بھی دکھلایا صرف Theory سے کام نہیں چلتا Practical تجربات بھی ضروری ہیں۔ انکا ارادہ تھا کہ اردو زبان کے ہر صنف پر عمل جراحی کیا جائے یہ ایک بڑا منصوبہ تھا مگر افسوس ہے کہ اس کام کا صرف ایک حصہ شائع ہو سکا یہ ایک فائدہ کی چیز ہے معلوم نہیں اس کے حصوں کے مسودے تیار تھے یا نہیں اگر ہوں تو انکو شائع ہونا چاہیئے۔

سخنہائے گفتنی یہ دراصل ان خیالات گفتنی و ناگفتنی کا مجموعہ ہے جو جناب کلیم کے وقتاً فوقتاً قلم کا نچوڑ کا نمونہ ہے۔ معاصر میں شذرات کے طور پر شائع ہوتے رہے۔ یہ ان کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ اور علمی و ادبی، ثقافتی اور تعلیمی نظریات کا مرقع ہے۔ عبارت میں رنگینی بھی ہے اور کہیں کہیں ظرافت اور طنز کی

جلوہ گری بھی۔ تلخی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ شیرینی بھی۔

میری تنقید۔ ایک بازدید دراصل یہ ایک مقالہ ہے جو خطبہ کے طور پر خدابخش لائبریری سیمینار کے سلسلے میں پیش کیا گیا۔ اس کتاب میں جناب کلیم نے اپنی تصانیف پر ایک اجمالی نظر ڈال کر یہ حقیقت پیش کی ہے کہ تنقید و اصول تنقید سے متعلق ان کے جو خیالات ابتدا میں تھے ساٹھ سال کے بعد بھی ان میں ردوبدل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ انھوں نے سوالات کے جواب دینے کے سلسلے میں یہ بھی واضح کیا کہ قارئین ان کی کتابوں کو غور سے نہیں پڑھتے صرف پہلا ہی جملہ دیکھ کر بدک جاتے ہیں۔ موڈ خراب ہو جاتا ہے اور وہ مطالعہ سے صحیح نتائج اخذ نہیں کرتے۔ اس پر راقم الحروف نے ان کو مشورہ دیا کہ بہتر ہوتا کہ وہ زہر آلود جملہ کتاب کے آخر میں بیان کیا جاتا تاکہ قارئین پوری کتاب غور سے پڑھ لیں، پھر وہ اس جملہ کو چار و ناچار حلق سے اتار لیں۔

ادبی تنقید کے اصول یہ ایک خطبہ ہے جو غلام السیدین میموریل ٹرسٹ کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ اس میں جناب کلیم نے ادبی تنقید کے اصول سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس مضمون سے متعلق جناب آل احمد سرور کا ایک تاثر اسی شمارے میں دیکھیے۔

اقبال ایک مطالعہ اقبال پر جناب کلیم نے اکثر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کو اقبال کی شاعرانہ صلاحیت سے انکار نہیں مگر ان کو شکوہ یہ ہے کہ اقبال کاش شاعری ہی کرتے پیغمبر بننے کی کوشش نہ کرتے۔ کلیم صاحب کو "شاعری جزویست از پیغمبری" پر اعتقاد نہیں۔ "اقبال ایک مطالعہ" ضخیم کتاب ہے، اس کتاب کے حوالے سے کلیم الدین احمد کے جو تاثرات اقبال سے متعلق ہیں ان کو راقم الحروف نے سفینہ[۱] (دسمبر ۸۲ء) میں درج کر دیا ہے قارئین اس کا مطالعہ کریں۔

تالیفات مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ کلیم الدین احمد نے بہتری کتابیں تالیف بھی کیں اور ان کی تدوین و ترتیب بھی وہ سب کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) دیوان جہاں:- بینی نرائن کا تذکرہ (۲) دو تذکرے یعنی شورش و عشقی کے دونوں تذکرے مشترکہ طور پر (۳) تذکرہ گلزار ابراہیم (۴) تاریخ نور (واجد علی شاہ کے عاشقانہ خطوط) (۵) دیوان جوشش عظیم آبادی (۶) رقص شرر (مسلم عظیم آبادی کا مجموعہ اشعار) (۷) دیوان شاد (۳ جلدوں میں) (۸) کلام فہیم الدین۔ بنام ولولے۔ (۹) مضامین فضل الرحمٰن بنام چار مقالے (۱۰) اپنی تلاش میں۔ خود نوشت سوانح، پانچ جلدوں میں۔ اس کی پہلی اور تیسری جلد شائع ہو چکی ہے (۱۱) انگریزی۔ اردو لغت (پانچ جلدوں میں) غیر مطبوعہ۔

ان کے علاوہ بہتیرے ایسے مضامین بھی ہیں جو اپنی طوالت

کے لحاظ سے مستقل کتاب کی شکل میں شائع ہو سکتی ہیں مثلاً شعراء
کی نوک جھونک۔ یہ شاعر لوگ مراثی انیس اور علم جواز گریہ اپنی
نظموں کے دو مجموعے ۴۲ نظمیں اور ۲۵ نظمیں بھی شائع کیں۔
الغرض کلیم الدین احمد اپنی تصانیف و تالیفات کا ایک ذخیرہ
چھوڑ گئے ہیں اور بہ حیثیت مدیر معاصر اپنا مقام بنا کر چلے گئے ہیں ہمیشہ
دنیا تک ان کا نام روشن و تابندہ رہے گا۔

بقیہ صفحہ ۵۲ کا

تاج پیامی۔ آرہ

کلیم الدین احمد کی تنقید تخریبی ہے۔ ان کو اردو
شاعری کی ہر صنف میں خامیاں نظر آتی ہیں
اگر اردو شاعری کی سارے اصناف میں خامیاں ہیں تو اس کے لئے
بھی کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی صاحب فہم اس تنقید کو تعمیری نہیں کہہ سکتا
شاعری کی کوئی صنف بھی ہو بذات خود خراب نہیں ہوتی۔
کلیم الدین احمد کی تخریبی تنقید پڑھ کر کوئی اردو ادب میں
دل چسپی لے سکتا ہے ہرگز نہیں، بلکہ اسے کم مایہ اور تہی
دامن سمجھ کر منہ موڑے گا۔
ابتدا میں ان کی تخریبی تنقیدوں سے اکثر لوگ مرعوب ہو گئے
اسکول اور کالجوں میں (دور انگلیسی میں) تعلیم کا نظام کچھ ایسا تھا کہ
لوگ اپنے آپ کو اور اپنے کارناموں کو خواہ وہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ
ہو حقیر سمجھتے تھے۔ انگریزوں کی محکومی سے مرعوب ہندستانی اپنی
تہذیب و ثقافت کو یورپ کی ادنی تہذیب و ثقافت کے مقابلے
میں حقیر و ذلیل سمجھنے لگے۔

جمیلؔ مظہری

خراجِ عقیدت

کل آ کے ساحلِ گنگا پہ کہہ رہی تھی نسیم | ہزار ادب کے خیاباں اور اک ریاضِ عظیم
چہ تشنگیٔ علوم و چہ تشنہ کامیٔ ذوق | ہزار موجِ سراب اک موجۂ تسنیم
شگاف کوہ سے پھوٹے ہزار چشمۂ فیض | ہزار تیشۂ فرہاد ایک ضربِ کلیم
خوشا وہ قائدِ دانشوراں کلیم الدین | جہانِ فن میں ہوا جس سے انقلابِ عظیم
وطن میں صبحِ درخشاں و نورِ مستقبل | چمن میں گیسوئے حورانِ مغرب کی شمیم
عصائے موسیٰ عمرانِ قلم کلیم کا ہے | جنونِ اہلِ بیاں جس سے مائلِ تنظیم
صنم کدے میں ادب کے ہوا جوان کا ورود | بنا عصائے کلیمی عصائے ابراہیم
گرے بتانِ قوی ہیکل اپنے طاقوں سے | کسی کی ناک شکستہ کسی کا سر ہے دو نیم
صنم کدے ہوئے ویراں صنم ہوئے مجروح | دہائی دینے لگے آزرانِ طرزِ قدیم
شعورِ نقد جو مخصوص ان کی دولت تھی | وہ اس دیار میں لٹنے لگی بہ لطفِ عمیم
نظر کے زاویے بدلے تو ذہن بھی بدلا | مگر ستم ہے جو بدلے مزاجِ ذوقِ سلیم
معلم ابنِ معلم ادیب ابنِ ادیب | بے معالجۂ فن حکیم ابنِ حکیم
تمام ان کے نقوشِ قدم کی روشن چھاپ | چہ پایہ گاہِ حکومت چہ مسندِ تعلیم
مبارک ان کے قدم کو یہ مظہری کا خراج | کہ جن کے آگے سبک ہے خراجِ ہفت اقلیم

یہ وہ گہر ہیں جو شاہوں کے طوق گلو بنے — خرید سکتے نہیں ان کو سکہ و زر و سیم
یہ ہار بن کے اسی کے گلے تک آتے ہیں — خلوص جس کا جھکاتا ہو گردن تسلیم
طبیعت اپنی تھی اک جیسے سرودِ نابستہ — تموج اس میں ہوا بہر جوشِ مدحِ کلیم
دعا یہ ہے کہ سلامت یہ خانوادہ رہے — دعا یہ ہے کہ سلامت یہ اعتبارِ حریم

یہ دیدِ بہار کی تاریخ ان پہ ناز کرے
یہ سلسلۂ فکر و فن دراز کرے

قطعۂ تاریخ رحلت کلیم الدین احمد
از ڈاکٹر عطا

یہ بلوا ادب کا درِ تابندہ کلیم — سنگ کھاتا ہے جدا گانہ کسی کی تقلید
وہ بنے ختم ہوئی زیست کی نایاب کتاب — نہ تو دیباچہ کوئی اور نہ کوئی تمہید
لکھنے پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا — سچ تو یہ ہے ہوا قرطاس و قلم کا وہ شہید
بات بے جو بھی تھی کہی کوئی جھجک تھی نہ باک — نہ تو تحسین کی خواہش اور نہ خوفِ تردید
سن کے رحلت کی خبر چھا گیا غم کا بادل — دل پہ صدمہ ہوا احباب نے اثر بھی شدید
تو ہے خاموش عطا تیرا قلم بھی خاموش — تو نہ لکھے کوئی تاریخ یہ تجھ سے ہے بعید
سن کے یہ دل سے صدا آئی سر یاس کے ساتھ — حیف صد حیف عطا بجھ گئی شمع تنقید
١٤٠٤ھ

قطعۂ تاریخ
از سید ناظم حسین

ادیبِ عصر رفت ناظم بخلد — کلیم آہ! دفتر شدہ غم بدوش
زباں و ادب گفت تاریخ فوت — ادیب سے معاصر شب شد خموش
١٩٨٣ء

عطا کاکوی

جس کا جتنا ظرف ہے، اتنا ہی وہ خاموش ہے

[پچاس سال پہلے کی ایک یاد]

دو آدمیوں میں برسوں تک روزانہ ملاقات کے بعد بھی آپس میں کبھی گفتگو نہ ہو سکے تو کیا آپ کو یقین آئے گا ؟

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ امر واقعہ ہے۔ یہ کوئی دو چار سال پہلے کی بات نہیں، دس بیس سال کی بھی نہیں بلکہ پورے پچاس سال پہلے کی ـــــــ نصف صدی کائنات کی نہ سہی، انسانی زندگی کی ایک طویل مدت ہے۔ اس طویل مدت میں نہ جانے ماضی کے کتنے نقوش تھے۔ کچھ تو مٹ گئے، کچھ دھندلے ہو گئے اب قوت حافظہ کو کریدکرید کر ان کو اجاگر بھی کرنا چاہے تو مکمل نقش تو ابھرنے سے رہا ہاں کچھ ہلکا سا عکس نمایاں ہو تو ہو۔

۱۹۲۶ء کی بات ہے ـــــــ اللہ اکبر! زمانہ کس تیزی سے رواں دواں ہے یہ کب کی بات ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہوں۔

میٹریکولیشن پاس کرنے کے بعد کالج کے آئی اے کلاس میں داخلہ ہو چکا ہے اس وقت پٹنہ میں آرٹس کے صرف دو ہی کالج تھے۔ ایک پٹنہ کالج، دوسرا

بی۔ این کالج۔ مگر داخلہ ہوا نیو کالج میں۔ یہ نیا کالج کہاں سے آگیا ــــ؟
نام تو اس کا کالج ہی تھا۔ مگر درحقیقت یہ اسکول اور کالج کی مخلوط شکل
تھی ــــ ہوا یہ کہ حکومت نے پٹنہ کالج کے آئی۔ اے کلاسوں
کو پٹنہ کالجیٹ میں منتقل کر دیا۔ یہ پٹنہ کالجیٹ وہی تھا جس میں کبھی
اس مسعود ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ پٹنہ کالجیٹ کی موجودہ عمارت
اب نہ سابق پاگل خانے کے احاطے میں بنی ہے پہلے یہ پٹنہ کالج سے
متصل یونیورسٹی لائبریری اور اس سے ملحقہ ہوسٹل کی عمارت میں تھا۔
آئی۔ اے کلاس کی منتقلی کے بعد اسکول کے چار ابتدائی درجے وہاں
سے الگ کر دیئے گئے۔ اب یہ نیو کالج آٹھویں درجے سے آئی۔ اے تک
عالم وجود میں آگیا۔

گرمی کی تعطیل کے بعد کالج کھلا۔ نئے نئے طلباء نیا نیا ماحول، کچھ دیہاتی
کچھ شہری، چند مزدرت سے زیادہ مسن، چند حد سے زیادہ کم سن۔ انہی کم
سنوں میں سب سے کم سن ایک دبلا پتلا نوجوان۔ نوجوان کیا طفل دبستان
کہیئے کلاس میں داخل۔ ارے یہ بھی آئی۔ اے کلاس میں داخل ہوئے
ہیں؟ شاید سمجھا ہوگا کہ اسکول کا کوئی درجہ ہے غلطی سے کالج کے کلاس
آ گئے ہوں گے ــــ نہیں یہ تو آ کر اطمینان سے بنچ پر خاموش بیٹھ گئے۔
آپ سمجھے یہ کون حضرت ہیں؟ اجی یہی ہیں آپ کے کلیم الدین احمد ــــ!

ایک پیکر خاموش، متانت اور سنجیدگی کا مجسمہ! کم آمیز نہیں بلکہ ناآمیز!! اب نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے والے انسان سے کوئی بولے تو کیا بولے اور کھیلے تو کیا کھیلے ــــــ؟ آجکل کا سا زمانہ تو تھا نہیں، ورنہ لڑکے سب تو الگ رہے، لڑکیاں ہی چھیڑ چھاڑ کر ناطقہ بند کیا کرتیں، ناطقہ کشا ہو جائیں۔

دو برس نیو کالج میں ساتھ رہنے اور ساتھ پڑھنے کے باوجود ایک ہم سے کیا کسی سے بھی کلیم صاحب ہمکلام نہ ہوئے۔ وہ احسان تھا استاذ محترم پروفیسر بیدلؔ صاحب کا۔ کبھی کبھی "مجسم خموشی" کو گویائی پر اکساتے اور سارے کلاس میں یہ غوغا ہو جاتا۔ ع

کہ اعجاز فلانے کرد گو بے زبانے را

کالج میں یوں تو کئی اساتذہ تھے مگر سب سے زیادہ جاذب توجہ اور قابل احترام پروفیسر بیدلؔ صاحب تھے۔ ان کا رکھ رکھاؤ، طرز رفتار وگفتار، ان کا رعب داب اور سب سے زیادہ ان کی شفقت و محبت ــــ ان کا کلاس دلچسپ بھی ہوتا تھا اور روح فرسا بھی۔ آخر ہم لوگ طلبا ہی تو تھے۔ ہلکی سی شرارت پر ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور کبھی بنچ پر کھڑا کردینا، کیا مجال کہ کوئی آہ بھی کرے۔

وہ تو خیر سے بیدلؔ تھے، آج کے بڑے دل گردہ والے پروفیسر

بھی ذرا کالج کے لڑکوں کو ۔ پنج پر کھڑا کر دیں تو جانیں ـــــ ! تو خیر
پروفیسر صاحب کا کلاس کیا ہوتا تھا ۔ ایک مشاعرہ کی مجلس سمجھئے ۔ آتے
اور تیز مگر مترنم لہجے میں کوئی غزل لکھا دی ، اس کے بعد باری باری اپنے خاص
تحکمانہ انداز میں " you " کہکر انگلی کے اشارے کسی ایک سے شعر کے معنی
بیان کرنے کو کہتے ۔ اشعار سے لطف تو درکنار روح خشک ہو جاتی کہ دیکھیں
اب کے کس کی باری ہے ۔ ہم لوگ اناپ شناپ ' الٹکل پچو ' جو جی میں آتا الٹے
سیدھے معنی بیان کر دیتے ۔ مگر ایک میرے ہی کیا سب کے دل میں یہ آرزو مچلتی
کہ کاش کبھی کلیم کی طرف بھی " you " کی انگلی اٹھتی ـــــ لیجئے ایک دن
خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہ آرزو پوری ہو کر رہی ۔

بیدل کی صاحب تشریف لا رہے ہیں ۔ ہر شخص اپنی جگہ سنبھل گیا ۔ آتے ہی
اپنے خاص لب و لہجہ میں زوردار مگر ترنم آمیز آواز سے کہا " نگار "
کی حالیہ اشاعت کی ایک غزل کے اشعار لکھوانا شروع کئے ، مطلع تھا ؎

مے کشو ! مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

پہلے تو غزل پوری یاد تھی ، اب ذہن سے فراموش ہو گئی ـــــ ہاں
ایک مصرع اور یاد آیا ۔ ؏

جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

غزل پوری لکھوائی جا چکی۔ اب انتظار ہے کہ دیکھیں کس کی گرفتاری ہوتی ہے ـــــــ اسے لیجیے! انگلی کا اشارہ کلیم کی طرف ہوا۔ اب سارا کلاس ہے کہ انہیں کی طرف متوجہ ہے! کلیم سب کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں ہے

سب لوگ جدھر وہ ہیں ادھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں"

اور کسی کا کلاس تو تھا نہیں۔ یہ کلاس تھا حضرت بیدل کا۔ سرتابی کی کسی کو مجال کہاں؟ کلیم صاحب کو اٹھنا پڑا ..... مگر کس طرح؟ــ لجائے شرمائے، زمین دوز نگاہیں۔ نرم اور دلکش آواز سے، کسی رکاوٹ اور تکیہ کلام کا سہارا لئے بغیر پورے شعر کا مفہوم زبان سے ادا ہو رہا ہے ــ بس ایسا معلوم ہوا کہ گراموفون سے ایک آواز مدت معیّنہ تک آتی رہی، پھر یکایک خاموشی ـــــــ ادھر کلاس پر تین طرح کی کیفیت طاری ــ حیرت، عبرت، اور غیرت" اور یہ مصرع سب کی سمجھ میں آگیا۔

؎ جس کا جتنا ظرف ہے وہ اتنا ہی خاموش ہے

حیرت اس بات پہ کہ ایک چھوٹا سا کوزہ اور سمندر کی یہ گہرائی ـــــــ؟ بعض نے عبرت حاصل کی۔ اور کتنے مارے غیرت کے آب آب ہو گئے۔

ایسا ہی ایک حادثہ "LOGIC" کے کلاس میں واقع ہوا ـــــــ

پروفیسر نرمل بیائے گھوش کا کلاس تھا۔ ان کی یہ ایک نرالی ادا تھی کہ کلاس کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ بس آئے، ورکری کا رخ دروازہ کی طرف کرکے بیٹھ گئے۔ اور سڑک کی طرف مخاطب ہوکر لکچر دینا شروع کر دیتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ مسمریزم کے عامل ہیں، بہرحال جو بھی ہو۔ ہاں ٹیوٹوریل کلاس میں کبھی کبھی سوالات بھی کر بیٹھتے تھے اور ہم لوگوں کو بغلیں جھانکنا پڑتی تھیں۔

ایک دن کلیم بھی پکڑے گئے۔ سوال ہوا۔ انہوں نے سوال کا جواب کچھ اس شان سے دیا، گویا:۔

ع ایک صیغہ تھا کہ فرفر سے گردان گئے

جواب اتنا مکمل اور تشفی بخش تھا کہ طلباء تو کیا خود پروفیسر صاحب کو بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ وہ آئی۔ اے کلاس کے ایک طالب علم سے ایسے فاضلانہ جواب کی توقع نہیں رکھتے تھے۔

جواب معمولی متداول کتاب یا نوٹ سے تو تھا نہیں۔ بلکہ جواب تھا ولٹن کی "LOGIC" سے۔ جو ہم لوگوں کے پلے نہیں پڑتی تھی ـــــ کلیم کو از بر یاد ـــــ

کیا آپ اب بھی اس سے انکار کریں گے کہ:۔

جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

کلیم الدین احمد خود اپنی نظر میں

(۱) لالٹین کی روشنی سڑکوں پر پڑتی ہے۔ تاریک گوشوں کو روشن کرتی ہے۔ اب اس روشنی میں گندگیاں جو پہلے سے موجود ہیں نظر آنے لگیں تو اس میں میرا یا اس لالٹین کا کیا قصور ــــ تنقید اسی قسم کی لالٹین ہے، اس کی روشنی شہر ادب کے قصروں، گلستانوں اور اس کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں گندگیاں نظر آنے لگیں تو قصور شہر ادب کا ہے یا تنقیدی روشنی کا۔ میری تنقید اسی قسم کی لالٹین ہے۔

(۲) میں ان لکھنے والوں میں نہیں ہوں جو "کاتا اور لے دوڑی" کہے جانے کے مستحق ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا وہ وسیع مطالعہ اور برسوں کے غور و فکر کے بعد

(۳) میں نے مغربی شاعری کے نقالوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آزاد نظم سے کم آزاد کوئی نظم نہیں ہے۔ آسانی کی خوگر طبیعت کو نظم سے زیادہ غزل دلاویز ہے۔ اور پابند نظم سے زیادہ آزاد نظم عزیز تر۔ کیوں کہ یہاں ہاتھ باگ پر نہیں ہوتا۔ اور نہ پانو

رکاب میں۔ رخش قلم رو میں رہتا ہے جب تھک جاتا ہے تو رک جاتا ہے
یہی وجہ ہے کہ آزاد نظم، نظم معرا، نثری نظم، شعری نثر وغیرہ کا ناموزوں
سیلاب ہے۔ اگر میں مغرب زدہ ہوتا تو آزاد نظم کا پرستار ہوتا۔ اور
آزاد نظم لکھنے والوں کی مداحی کرتا۔ لیکن صورت حال کچھ اور ہے۔
وہ فارسی کی پیروی ہو یا انگریزی کی اگر کامیاب ہے تو قابل ستائش
ہے ورنہ نہیں۔

(۴) کسی نے اردو شاعری کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی زحمت گوارا
نہیں کی۔ یہ کتاب منتشر خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مربوط منظم اور مسلسل
تنقید ہے اسلئے شاید نیاز فتح پوری نے لکھا تھا کہ یہ اردو شاعری پر پہلی
کتاب ہے جس کا ایک ورق بھی بیکار نہیں لیکن قارئین ادھر ادھر سے
چند جملے چن کر ان پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کے بس کی بات
نہیں کہ وہ اسے غور سے پڑھیں یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ کیا کیا
جا رہا ہے اور کیوں کہا جا رہا ہے۔ کیوں کہ یہاں غیر ذمہ دارانہ نادری
احکام نہیں ہیں۔ منطقی باتیں ہیں۔ منطقی دلائل ہیں۔ منطقی اور سائنسی
زبانیں ہیں۔ ان کا جواب جذباتی ردعمل نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے

(۵) جہاں میری تنقید سے متعلق بہت سی باتیں کہی گئی ہیں وہاں ایک یہ
بھی ہے کہ میری تنقید تخریبی ہے۔ تو اگر تنقید کا مفہوم آپ کے خیال میں نری

مداحی ہے تو البتہ میری تنقید تخریبی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اچھی
تنقید تخریبی نہیں ہوتی یہ ہمیشہ تعمیری ہوتی ہے وہ کسی صنف سے متعلق
ہو یا کسی شاعر سے میں نے ہمیشہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو چیز پیش
نظر ہے وہ کیا ہے۔ اسکی حدود و امکانات کیا ہیں، یا اسمیں کیا کمی ہے
اور کیا ہونا چاہیئے۔

(۶) ایک بات اور کہوں اس سے میرا تنقیدی نظریہ بھی واضح ہو جائے گا۔
" نقاد کو اپنے دماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھنا چاہیئے۔ تاکہ اس میں
نئے، تازہ، زندہ، زندگی بخش اور ان جانے خیالات بے تکلف سما سکیں
وہ خیالات جو دوسرے ادیبوں اور کلچروں میں رواں دواں ہیں۔
ہمیں اپنے خیالات کے ذخیرے میں صحت مند اور تازہ خیالات کا
اضافہ کرتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ وہی فیصلہ درخور اعتنا ہے۔
جو صاف، غیر جانب دار اور برازمعلومات دماغ کرتا ہے۔
نقاد کو ہمیشہ علم اور تازہ علم کی پیاس چاہیئے۔
دنیائے ادب اور دنیائے خیالات ایک ہے۔ اس کو مختلف حصوں
میں تقسیم کرنا، مختلف قسم کی رکاوٹیں پیدا کرنا خودکشی کرنا ہے۔ کوئی
شاعر کوئی فنکار، تنہا علاحدہ وجود نہیں رکھتا۔ اس کی صحیح قدرو

سے زیادہ تلخی تھی۔ لوگ برہم ہوئے لیکن یہ تو ہوا کہ ان کی Complacency جاتی رہی اور اس برہمی کا نتیجہ تھا کہ اکثر و بیشتر "خنجر کھلے کھلے تھے تو نشتر چھپے چھپے" لیکن مجھے بالکل پروا نہ تھی

(۱۳) میں نے میٹرک ۱۹۲۴ء میں دوسرے درجہ میں پاس کیا لیکن دوسرے درجہ سے دل کو ایک ٹھیس سی لگی، اور میری زندگی اندرونی ہو گئی، خارجی دنیا سے دور بہت دور۔

(۱۴) میں حسب معمول آخری بنچ پر بیٹھا تھا۔ فیض الدین اور عطاء الدین (کلاس کے دو ساتھی) آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے سنا کر کہا "معشوق بے نیاز کی عرفی کیا ہو گی"؟ میں نے زیر لب کہا "اللہ الصمد" فصیح نے کہا "کیا کہا"؟ میں نے کہا "کچھ بھی نہیں"۔

(۱۵) میں اکثر سوچتا ہوں کہ میں نے اگر اردو غزل کے سلسلے میں "نیم وحشی" کا لفظ استعمال نہ کیا ہوتا تو شاید اتنا شور و غوغا نہ مچتا لیکن مجھے ایسا لگا کہ لوگوں کو غزل کی خامیوں کا ادھورا احساس ہے اسی لئے میں نے سوچا کہ بات دو ٹوک کہہ دی جائے۔

(۱۶) میں نے غزل کی مخالفت نہیں کی تھی صرف صنف غزل کی خامیوں پر روشنی ڈالی تھی۔ دور حاضر کی غزلوں میں مضامین نئے ہیں اور کبھی کبھی شعروں میں تسلسل بھی نظر آتا ہے لیکن غزل

آج بھی غزل ہے۔ ان میں بھی وہی صنفی خامیاں ہیں یعنی آج بھی نیم وحشی صنف شاعری ہے۔

(۱۷) بڑی شکایت یہ ہے کہ میں نے اقبال کو بھی نہ چھوڑا۔ یہاں چھوڑنا نہ چھوڑنا غیر متعلق سی بات ہے، میری تھیسس (Thesis) یہ ہے (۱) قومی وملی شاعری سریع التاثیر ہوتی ہے۔ چند جذبات کو زور سے ابھارتی ہے لیکن اس کی دنیا بہت تنگ ہے۔ (۲) پیغام محض شعر نہیں ہو سکتا۔ پیغام اور شعر میں کوئی بیر نہیں شرط یہ ہے کہ پیغام شعری تجربہ بن جائے لیکن ایسا کم ہوتا ہے۔ میں نے اپنی اصول کی روشنی میں اقبال کی نظموں کا جائزہ لیا ہے۔

(۱۸) میری تنقید کی ابتدا "گل نغمہ" (مجموعۂ کلام ڈاکٹر عظیم الدین احمد) سے ہوئی ہے۔ میں نے اس کتاب کے مقدمہ کا پہلا حصہ جو ۳۰ سال قبل لکھا گیا تھا پھر پڑھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ جو کچھ میں نے لکھا تھا اسکی تفسیر وتشریح میری ان دو کتابوں "(اردو شاعری اور اردو تنقید) میں ہے اور اس کی بھی خوشی ہوئی کہ میں ایک صراط مستقیم پر چلتا رہا کبھی اس سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔

(۱۹) کلیات شاد کی تدوین کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے۔

اس میں پہلی بار اس وسیع پیمانہ پر اختلاف لسنخ نہیں بلکہ شاعر کی اپنے شعروں پر اصلاحوں کی، اس کے اپنے شعروں کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوششوں کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسری اہمیت اس کی یہ ہے کہ اس حقیقت کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا گیا ہے کہ شاعری وجدان نہیں۔ الہام نہیں، وحی نہیں بلکہ ذہنی کوہ کنی ہے۔

(۲۰) میں نے شاعری کی اہمیت پر زور دیا اور اسے وہ مقام دیا جو شاید اسے اردو میں حاصل نہ تھا۔ پھر شاعری کی جامع تعریف کی اور شاعر کی بھی۔ پھر تخئیل کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور قوت حاسہ کی اہمیت پر بھی جو اردو تنقید کیلئے نئی چیز تھی۔ آزاد اور حالی نے مغرب کے زیر اثر نظمیں لکھیں اور نظم لکھنے کی ترغیب دی لیکن ان کے ذہن میں نظم کا صاف Conception نہ تھا میں نے پہلی بار واضح طور پر بتایا کہ نظم کیا ہے بعد میں سرور صاحب اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے نظم سے متعلق (غالباً سوغات میں) وہی باتیں لکھیں جو میں نے ۱۹۴۰ء میں لکھی تھیں۔

(۲۱) میں نے صرف دوسرے نقادوں پر نکتہ چینیاں نہیں کی

ہیں بلکہ مثبت باتیں کی ہیں اور کیا ہونا چاہئے یعنی اصول تنقید پر میں نے مفصل بحث کی ہے اور اصولی باتوں سے متعلق اجمالی لیکن واضح اشاروں کی کمی نہیں۔

(۲۲) میرا ارادہ تھا کہ سارے (اردو کے) تذکروں کو اکٹھا کرکے ہر شاعر کے جو حالات مختلف تذکروں میں ملتے ہیں انہیں ترتیب وار جمع کر دیا جائے اور ان کے شعروں کو بھی۔ اسطرح اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کسی شاعر سے متعلق تذکروں میں کیا معلومات اور ان کے کون سے اشعار نقل کئے گئے ہیں تو وہ بیک نظر آپ کو مل جاتے۔ پھر یہ بھی ارادہ تھا کہ چار پانچ جلدوں میں ان تذکرہ نگاروں کے حالات اور ان کے تذکروں پر مفصل تنقید بھی کی جائے اور یہ کام بہت آگے بڑھ چکا بھی تھا اور تمام مطبوعہ اور قلمی تذکروں کی نقلیں بھی فراہم کر لی گئیں تھیں اور ۷۵ فی صد کام ختم بھی ہو گیا تھا لیکن ۱۹۷۵ء کے سیلاب میں جہاں میری ساری لائبریری تباہ ہو گئی وہاں چالیس موٹی موٹی فائلیں بھی برباد ہو گئیں۔ اور اب مہلت عمر ہے اور نہ اتنی سکت باقی ہے کہ دوبارہ اس کام کو شروع کیا جائے

(۲۳) "اپنی تلاش میں" اگرچہ خود نوشت سوانح حیات ہے لیکن

اس کتاب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ میں نے تنقید کی راہ کیسے اور کیوں اختیار کی اور میری تنقید پر کون کون سے شعوری اور غیر شعوری اثرات پڑے۔ جنہیں میری تنقیدوں سے دلچسپی ہے ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (اس کتاب کی پہلی اور تیسری جلد شائع ہو چکی ہے، دوسری جلد لکھی جا چکی ہے، چوتھی اور آخری جلد ابھی لکھنا باقی ہے)

(۲۴) سنا ہے کہ میری پیدائش کا دن ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء اور وقت ساڑھے چھ بجے شام ہے۔ نہ کسی نے اس پیدائش کی بشارت دی تھی اور نہ کسی نے ستارے کے آسمان پر چمکنے کا ذکر یوں اس واقعہ کی طرف لوگوں کی رہنمائی کی تھی اور اب ۶۱ سال کی عمر میں سوچتا ہوں کہ وہ دن جلد آنیوالا ہے جب لوگ کہیں گے "یہ کس کا جنازہ اٹھا ہے" اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جب جنازہ اٹھے گا تو نہ عبرت سر جھکائے گی اور نہ حیرت آئینہ دیکھے گی۔ آنکھیں اداس نہ ہوں گی۔ سر بوجھ سے جھکے ہوئے نہ ہوں گے، دل داغ سے بھرے ہوئے نہ ہوں گے۔ طرح طرح کی باتیں ہوں گی۔ آہیں نہ ہوں گی اور نہ کوئی خاک سر پہ ڈالے گا اور نہ کوئی گریباں چاک ہوگا اور نہ یہ وصیت کرنے کی ضرورت ہوگی کہ کوئی شخص مجھے یاد نہ رکھے۔

کلیم الدین ادیبوں کی نظر میں

قاضی عبدالودود کلیم الدین احمد صاحب کم سخن ہی نہیں کم آمیز اور دیر آشنا بھی ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں کھلم کھلا کہتے ہیں اور طنز سے خواہ خفی ہو یا جلی بہت کم کام لیتے ہیں۔ مبالغے سے وہ بچنا چاہتے ہیں، لیکن ایک دو جگہ ان سے اس کا ارتکاب ہوا ہے۔ اردو میں اعلیٰ درجے کی تنقید مفقود سہی مگر تنقید کے وجود سے انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں تحکم اور تضاد بھی ہے۔ وہ برے کو برا نہ کہنا شعبہ نہار کی ک[illegible] اچھوں پر ظلم سمجھتے ہیں۔ انہیں اپنی ناقدانہ رایوں پر پورا اعتماد ہے۔ اور مخالفت سے نہیں ڈرتے۔ نقاد کی حیثیت سے وہ بڑے سخت گیر ہیں گا

عملی زندگی میں بڑے نرم پایا۔

میرا خیال ہے کہ ان کے معاصرین میں کوئی نقاد ان کا مقابلہ نہیں کر[illegible] انہوں نے اردو تنقید میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس میں خا[illegible] خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس میں [illegible] قصور نہیں، لوگوں کی قدامت پسند[illegible] [illegible] ذمہ دار ہے۔ ان کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان[illegible]

کی زیادہ قدر نہیں ہوئی۔ زمانہ فیصلہ کرے گا کہ ان کا مرتبہ کیا ہے۔
انہوں نے کئی قدیم متون اپنی ترتیب و تصحیح کے ساتھ شائع کئے ہیں۔
مگر مطالب کی تنقید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ ڈی لٹ، پی۔ ایچ ڈی کے
مقالات کے ممتحن رہے ہیں مگر اس معاملے میں وہ مطلقاً سخت گیر نہیں۔

فخرالدین علی احمد — میں کلیم الدین احمد صاحب کو ایک عرصے سے
جانتا ہوں، اور ان کی خداداد صلاحیتوں سے واقف ہوں۔ انہوں
نے جس محنت و مشقت سے اردو ادب کی خدمت کی ہے، اس سے طالبِ
ادب عام طور سے اور علم و ادب کے شائقین خاص طور سے ان کی قدر
افزائی فرمائیں گے۔

ڈاکٹر عبدالقیوم — اردو تنقید میں کلیم الدین احمد اپنے انفرادی خیالات
اور سنسنی خیز جملوں کی وجہ سے کافی مشہور رہے ہیں۔ وہ کہیں کہیں صحیح نتائج اخذ
کرتے ہیں لیکن تفصیلات میں پہنچ کر بہک جاتے ہیں انہوں نے بے لاگ . . ائید.
دی ہیں۔ ان کی صاف گوئی قابلِ احترام ہے۔ لیکن سب رائیں صحیح نہیں . . . ،
یہاں شدتِ احساس ہے اور تخیل کی فراوانی بھی۔ ان کی انتہا پسندی . . .
نے صحتمند تنقید کا خون کر دیا۔ ان کی روش تعمیری نہیں، بلکہ خطرناک ہے
وہ نقاد کے منصب سے ہٹ کر محض نکتہ چیں رہ جاتے ہیں۔ . . . ان کی . . .

بڑی ٹریجڈی ہے۔

"ان کی تنقید سے فائدہ کم پہنچا اور نقصان زیادہ۔"

احتشام حسین | جس کسوٹی پر میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، مومنؔ، جوشؔ، فیضؔ، ذوقؔ، آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، مجنوںؔ، سرورؔ، سب ناقص ٹھہرتے ہیں ممکن ہے اسکی کسوٹی ہی میں کوئی خرابی ہو۔ اور اس نے لکھنے والے کے مافی الضمیر کو سمجھنے کی کوشش نہ کی ہو، یا نفسیاتی طور سے وہ ایک ایسی شخصیت رکھتا ہو جو متوازن اور صحت مند نہیں ہے بلکہ احساس برتری یا کمتری نے اسے مریض بنا دیا ہے۔

کلیم الدین احمد جو اصول تنقید بتاتے ہیں از بر خود عمل نہیں کرتے۔ ان کی توجہ کل پر نہیں بلکہ جزو پر زیادہ ہوتی ہے۔ اور وہ انہی کی بنیاد پر عمومی فیصلے صادر کرتے ہیں۔

آل احمد سرور | کلیم الدین بہت سے نقادوں سے زیادہ سوچی ہوئی اور خیال آفریں باتیں کرتے ہیں۔ مگر ان کی تنقید اور بلند ہوتی اگر وہ اپنے قدیم سرمائے سے اس قدر بیزار نہ ہوتے، اور ان کے ہاں تاریخ اور ادب کے تسلسل کا شعور اور زیادہ نمایاں ہوتا۔ اور ان کی تنقید گلستاں میں کانٹوں کی تلاش نہ بن جاتی۔

کلیم الدین نے بت شکنی کا فرض انجام دیا ہے۔ اگرچہ ان کی تیشہ زنی نے ایک قصر کو کھنڈر بنا دیا۔

ابن فرید | کلیم الدین احمد کی تنقیدی صلاحیتوں کے بارے میں مجھے

بڑے مخالفوں نے اعتراف کیا ہے۔ ان کے ہاں انتہا پسندی ہے وہ اردو
ادب کو مغربی عینک سے دیکھتے ہیں۔ مشرق کی کوئی چیز ان کے نزدیک لائق اعتنا
نہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ تنقید میں ایک مصلحانہ کردار ادا کیا
ہے۔ بڑے سے بڑا تنقید نگار بھی ان کے بعض نکتوں کو دہراتا ہوا ملے گا۔

تنقید کے فن پر عبور ہونے کی وجہ سے وہ وافر مواد مطالعہ پیش کرتے
ہیں۔ انہوں نے نئی نسل کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ تنقید کو سنجیدہ فن بنانے کی
کوشش کی ہے۔ انہوں نے تیشہ زنی سے تنقید کو علوے مرتبہ بخشا۔ اس حیثیت
سے ان کی اہمیت کا اقرار کرنا ہوگا۔

ابواللیث صدیقی | کلیم الدین کی دونوں تنقیدی کتابوں کا پڑھنے والا
محسوس کرنے لگتا ہے کہ اردو شاعری اور اردو تنقید دونوں کی کچھ حقیقت
نہیں۔ ان کی تحریریں بلا شبہ ان کی ذہانت کی ترجمان ہیں لیکن ان کا انداز فکر اتنا
کمزور ہے کہ ان کی آواز کی بازگشت دور دور تک نہیں ملتی۔ انہوں نے اردو
شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ | کلیم الدین کی تنقید مرعوب کن ہوتی ہے۔ تنقید کا
ایک خاص انداز اور بیان میں مدعا نگاری ان کے اوصاف خاص
ہیں لیکن قاری کو کچھ اجنبیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے
ادیبوں کی قدر شناسی کیلئے کثرت سے مغربی اصولوں کا استعمال کرتے ہیں اور

انہیں کی روشنی میں ملکی سرمایۂ ادبی کے حسن وقبح کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک نقطۂ نظر کے نمائندہ ہیں اور دورِ جدید کے ناقدوں میں انہیں اہم مقام دیئے بغیر چارہ نہیں۔

احسن فاروقی | کلیم الدین احمد انگریزی ادب میں پورے طور پر ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کا علم صحیح ہے وسیع ہے اور گہرا ہے۔ انہیں علم سے محبت ہے، ان کا شعور پختہ ہے۔ وہ اپنی انفرادی رائے رکھتے ہیں۔ ان کی رایوں سے ہم اتفاق نہ کریں مگر ان پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ڈھل مل یقین ہیں۔"

ان کی تنقید کو صحیح ہمدردی کے ساتھ جانچا جا سکتا ہے۔

اردو تنقید میں حالی کے بعد اگر کوئی ہستی اہم ٹھہرتی ہے تو وہ پروفیسر کلیم الدین کی ہے۔ جہاں تک علم تنقید کا تعلق ہے کلیم صاحب ہر طرح پختہ ہیں اور حالی ہر طرح خام مگر فن تنقید کو برتنے کا جو ک حالی میں موجود ہے، کلیم میں مفقود ہے ان کی ہستی اس دور میں مثالی ہے۔ لیکن ان کی پیروی میں لکیر کے فقیر ہو جانے کی ضرورت نہیں۔

آل احمد سرور | کلیم الدین احمد کی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" پر جو ہنگامہ برپا ہوا تھا معلوم نہیں اس سے لوگوں نے کیا اثر لیا کہیں ان کی موجودہ خاموشی اس جرأت رندانہ پر پشیمانی نہ ہو۔ بہرحال

اس کتاب میں ایک نہایت اہم ادبی اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ
یہ ہے کہ باوجود ملکوں اور تہذیبوں کے فرق، جغرافیائی حالات کے اختلاف
اور تاریخ و تمدن کے علاحدہ علاحدہ ہونے کے ادبیات میں بعض مشترک
اور عالمگیر اصول بھی ہیں۔ فن کا معیار مختلف سہی لیکن حسن کا احساس مختلف
نہیں بدلا ہے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم

چند نقادوں نے اخلاقی، تاثراتی اور نفسیاتی تنقید
کی پابندیوں اور کوتاہیوں کا احساس دلایا اور جدید ادبی نقطۂ نظر
کو روشناس کرانے کی کوشش کی۔ ان میں کلیم الدین احمد خاص طور
پر قابل ذکر ہیں ۔۔۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں مختلف ادبی تصانیف
اور تنقیدی نظریوں کا بڑی حد تک وضاحتی جائزہ لیا اور دو ٹوک
باتیں کہیں۔ بعض نقادوں نے ان کی معقول باتوں کا اثر بھی قبول کیا
ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہماری تنقید کے لئے اردو میں راہ ہموار
ہو جاتی اور ہمارے تخلیقی اور تنقیدی رویوں میں تبدیلی رونما ہوتی
لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کلیم الدین احمد کی باتوں پر دھیان دینے کی بجائے مخالفین
نے انہیں رسوا کرنا چاہا۔ وہ ان کے بعض جملوں اور فقروں کو لے اڑے
اور کہا گیا کہ وہ مغرب زدہ نقاد ہیں۔ اردو شعر و ادب کو حقارت کی نظر
سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تنقید تعمیری نہیں بلکہ تخریبی ہے۔ اس میں قصور

خود ان کا بھی ہے۔ جو معیار نقد انہوں نے پیش کیا وہ اسے کامیابی سے برت نہیں سکے۔ اور بے تکلفی کے بڑھتے ہوئے میلان نے ان میں تخریب پسند نقاد کا سزاوار بنا دیا۔

ڈاکٹر صفیہ پروین: پروفیسر کلیم الدین احمد کی شخصیت اردو تنقید میں سب سے الگ اور نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی تنقیدی تخلیق "اردو شاعری پر ایک نظر" کی اشاعت کے فوراً بعد ہندوستان گیر شہرت حاصل کر لی لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے، کہ اس شہرت میں ان کو نیک نامی بہت کم نصیب ہوئی۔ ان کی تنقیدی صلاحیتوں پر جوابی تنقید کی راہ کھل گئی۔ اور وہ عرصۂ پیکار نقد میں تنہا رہ گئے۔

اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اردو شاعری کی جن خامیوں کی جانب ارباب نظر کی توجہ مبذول کرائی ان میں اکثر و بیشتر قابل قدر تھیں لیکن انہوں نے جو انداز اختیار کیا وہ حقیقت پسندی سے بہت دور تھا۔ انہوں نے اپنی تنقید کی بنیاد انگریزی ادب اور تنقید پر رکھی۔ انگریزی ادب کا مزاج یقیناً اردو ادب سے مختلف رہا ہے۔ اسکے مقرر کردہ معیار انتقاد پر اردو ادب کے شہ پارے پورے نہیں اتر سکتے۔

سید نورالحسن

کلیم الدین احمد صاحب اردو کے اہم نقادوں میں ہیں۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور خصوصیت کیساتھ اردو شاعری پر ایک نظر، سخنہائے گفتنی، اردو تنقید پر ایک نظر اور عملی تنقید کے ذریعہ اردو ادب اور تنقید کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ وہ اردو ادب میں ایک خاص نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی اہمیت اور تنقیدی بصیرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اردو تنقید کی عمر ابھی بہت کم ہے اسلئے اردو ناقدوں کی فہرست میں ایسے لوگوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جنھوں نے ایسے تنقیدی اصول وضع کئے ہوں جس کے پیش نظر ادبی قدروں کا تعین کیا جا سکے۔

کلیم الدین احمد صاحب اردو کے ان چند ناقدوں میں ہیں جنھوں نے ادبی پرکھ کیلئے بعض اصول وضع کرنے کی کوشش کی ہے جن کے ذریعہ اردو کے شعری اور نثری کارناموں کو پرکھا جا سکتا ہے۔

کلیم الدین احمد صاحب نے اسوقت اردو تنقید کے میدان میں قدم رکھا جب ایک طرف اردو تنقید میں حالیؔ کی ادبی اصلاح کی تحریک کا اثر نمایاں تھا اور دوسری طرف ترقی پسند رجحانات کے تحت ادب کا سماجی نقطۂ نظر رفتہ رفتہ اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ لیکن کوئی واضح

5776
17.3.89

ـ ـتہ نہ ہونے کی وجہ سے سہل پسندانہ فیصلے عام تھے۔ کلیم الدین احمد صاحب نے اپنی بے لاگ تنقیدوں سے اس سہل پسندانہ رویے پر سخت ضرب لگائی۔ ان کی تنقیدوں نے اردو والوں کو صرف چونکایا ہی نہیں بلکہ انہیں ان کی ذمہ داری کا احساس دلانے کیلئے جھنجھوڑا بھی۔

کلیم الدین احمد صاحب نے اپنی تنقیدوں میں فن کار کی شخصیت اور انکی کوششوں کے تجزئے پر زیادہ زور دیا۔ انھوں نے ادبی قدروں کے تعین کے سلسلہ میں جمالیاتی اور فنی خوبیوں اور لغیاتی عوامل سے بھی استفادہ کیا۔ چوں کہ انگریزی اور دیگر مغربی ادبیات پر وہ بڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ اسلئے اس کا اثر بھی ان کے یہاں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے مطالعہ کی گہرائی اور وسعت نظر سے بلاشبہ اردو تنقید کو فائدہ پہنچا۔ انھوں نے اب تک اردو تنقید و تحقیق کے سلسلے میں جو کچھ کام کیا ہے اسے ہمیشہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

پرنسپل عبدالشکور: کلیم صاحب کی تنقیدی کتابوں کو پڑھکر طالب علم کھو سا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو تاریکی میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ... جذبات و معتقدات میں تلاطم برپا کر دیتی ہیں۔ لیکن دماغ پر ناآسودگی کا تاثر

نہیں پیدا کرتیں۔ غیر ذمہ دارانہ جملے جوان کے قلم سے نکلے ہیں، پتہ نہیں کیا کہتے ہیں ۔۔۔ کہتے ہیں کہ تنقید کوئی کھیل نہیں، لیکن پتہ نہیں چلتا کہ خود انہوں نے یہ کھیل کیوں کھیلا۔ مغربی ہتھیاروں سے مشرقی معتقدات کو مسمار کرتے جاتا۔ اور سوائے ایک لیمپ "گل نغمہ" کے باقی سب لیمپوں کو گل کرتے چلے جاتا۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دنیائے اردو میں گھپ اندھیرا چھا جائے۔ ان کے تنقیدی اوصاف قابل ستائش ہوتے مگر وہ "گل نغمہ" پہ مقدمہ نہ لکھتے۔ اور اگر لکھتے تو بھول فراموش کر دیتے کہ اس کا مصنف کون ہے۔

پروفیسر محسن | کلیم الدین احمد نہ آدمی ہیں نہ حیوان۔ آپ جب پہلی بار ان کے روبرو ہوں گے تو محسوس کریں گے کہ ایک بیجان پتلا آپ کے مقابل کرسی پر بٹھا دیا گیا ہے جس کے اندر کچھ ایسے کل پرزے کام کر رہے ہیں کہ اس کے سر میں تھوڑی تھوڑی دیر پر اشباتی انداز میں جنبش ہو جاتی ہے اور لبوں پر کچھ ایسی شکنیں نمودار ہو جاتی ہیں جن سے مسکراہٹ کا گمان ہوتا ہے لیکن اگر آپ آدمی کی تعریف میں اس کی بے پایاں فکر و نظر، تجسس و تعقل کی صلاحیتوں کو نمایاں حیثیت دیں گے تو کلیم الدین کو آپ محض آدمی تصور کریں گے اور حیوان کے دائرے سے انہیں خارج کرنا پڑے گا۔

پروفیسر سید حسن | کلیم الدین احمد نے اپنے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی "گل نغمہ" پر مقدمہ لکھ کر اردو کے ادبی حلقوں میں ایک ہلچل مچا دی۔ بہتوں نے اس مقدمہ کو ایک مبتدی کا کارنامہ، ایک طفلانہ عمل، ایک نووارد کا نقش اول، ایک بیٹے کا باپ کو خراج عقیدت سمجھ کر قابل اعتناء نہ سمجھا۔ پھر ایک نیا گل کھلا۔ ان کی معرکہ انگیز تصنیف "اردو شاعری پر ایک نظر" شائع ہوئی۔ اس میں اردو کے مشہور مستند شعراء کے بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ دکان شیشہ تراشی میں کوئی مست بیل آگھسا ہے۔ مخالفت اور مدافعت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ تلخ و تند باتیں کہی گئیں۔ ابھی طوفان تھمنے بھی نہ پایا تھا کہ انہوں نے ایک اور کتاب میدان کارزار میں لاکر رکھ دی "اردو تنقید پر ایک نظر" ایک نہ شد دو شد۔ طوفان نے شدت اختیار کی۔ بادل گرجے، بجلیاں چمکیں لیکن جب کچھ دنوں کے بعد فضا کچھ صاف ہوئی تعصب اور تنگ نظری کا پردہ اٹھا تو معلوم ہوا کہ اردو تنقید کے راستے میں ایسا چراغ جلا دیا گیا ہے جس کی روشنی میں نقد ادب کی منزل صاف اور واضح دکھائی دینے لگی ہے۔

ڈاکٹر منوہر سہائے انور | کلیم الدین احمد مغرب زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو مغربی عینک سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے مغرب سے

بہت کچھ لیا ہے، لے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے۔ لیکن اس سے یہ
لازم نہیں آتا کہ اپنی اقدار ترک کر دیں اور اپنے افکار و اسالیب
یا ان کی ہیئت ہی بدل ڈالیں۔ غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہنا تمام
قدیم و جدید ایرانی، ہندوستانی اور پاکستانی غزل گو شعراء کو بے
ادبی کرنے کے مترادف ہے۔

ناظر کاکوروی | کلیم الدین احمد کو فراق و مجنوں کی طرح صحیح
ناقدانہ ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ وہ جو کچھ
لکھتے ہیں اسمیں خلوص اور اثر ہوتا ہے۔ نگارشات ادبی کے محاسن و
معائب پر پوری نگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب میں خاصا
اضافہ کیا ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بیحد بلند ہے۔ متقدمین پر انکی
دارو گیر ضرورت سے زیادہ سخت تھی لیکن متاخرین و معاصرین کے
مقابلے میں ان کا لب و لہجہ بہت کچھ بدل گیا ہے، اور ان کے افکار
و آراء میں بھی توازن پیدا ہو گیا ہے۔ اکثر پچھلی تنقیدی دلائل پر نرمی
اور سکون سے نظر ثانی کرنا بھی مناسب سمجھا اور یہ کامیابی کی دلیل
ہے۔

محمد عظیم | کلیم الدین احمد اردو ادب میں پہلا نقاد ہے جس میں
متانت کے ساتھ صاف گوئی اور بے باکی ملتی ہے، اور یہ مسرت

ہے کہ اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔ نئے اور پرانے
ادبا نے کسی نہ کسی حد تک ضرور اس سے اثر قبول کیا ہے۔ نا ممکن
ہے اردو غزل کا ذکر ہو اور کلیم الدین کا نام نہ آئے، وہ بجا طور
پر اپنے متعلق کہہ سکتے ہیں سے

جو کو کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
مری نوا نے دیا جذبہ ہائے ذوق بلند

شریف ارشد کلیم الدین احمد اردو تنقید میں ایک لمعۂ نور ہیں
انہوں نے باغبان کی طرح اردو نظم و نثر کے گلشن کی جو شاخیں
سوکھ چکی تھیں انہیں کاٹ ڈالا۔ تراش و خراش کے اس عمل سے
اردو شعر و ادب کا غیر معتبر سرمایہ مطعون ٹھہرا اور معتبر سرمایہ متعین ہوا۔
ان کے خیال میں تنقید اور باغبانی کا عمل ایک سا ہے۔ انہوں نے
تنقید کو سائنسی علوم کی طرح منضبط اور منظم کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ
تبصرہ اور تذکرہ تنقید نہیں۔ اردو ادب پر انہوں نے نشتر لگایا اور
فاسد مادّوں کو نکال کر رکھ دیا۔ وہ مفلوج اعضاء کو جوڑنے کے نہیں
کاٹ دینے کے حق میں تھے، وہ اردو تنقید کے سرجن تھے۔ اس
سرجری کیلئے انہوں نے اگر آلات سرجری مغرب سے درآمد کئے تو
یہ کوئی عیب نہیں، نئی نسل ان کی تنقیدات اور نظریات سے بہت مستفیض

ہوتی ہے۔

عبادت بریلوی | کلیم الدین احمد مغربی ادبیات سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اس تاثر نے انہیں مبہوت کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے مشرقی ادب کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں، وہ اچھی تنقید کر سکتے ہیں لیکن عملی تنقید کے جو اصول ہیں وہ ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی تنقید میں ہمدردی کا عنصر نام کو نہیں۔ وہ بہت جلد رائے قائم کر لیتے ہیں اسی وجہ سے ان کی تنقیدی رائیں زیادہ تر اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں تنقید کی بڑی صلاحیت تھی لیکن انکی جذباتیت اور بدگمانی ان کو لے ڈوبی جس سے وہ کہیں کے نہیں رہے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی | کسی زبان کے ادب کے مزاج کو سمجھے بغیر دوسری زبان کے تنقیدی معیاروں سے جانچنے میں انسان کے راستہ بھٹک جانے کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ کلیم الدین احمد صاحب کے نظریات سے خواہ اتفاق کریں یا اختلاف مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے اردو غزل کے سلسلہ میں تنقید کو ایک نیا زاویہ نظر بخشا ہے۔ ان کے منفی رجحانات سے کتنی اثبات کی منزلیں طے ہو گئیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ کلیم صاحب کی ان تنقیدوں سے یہ فائدہ بھی ضرور ہوا ہے کہ ناقدین کی توجہ مغربی اصول نقد

کی جانب خاص توجہ مبذول ہو گئی، اور اب تک شعر و
طور پر یہ سوال ان کے سامنے آیا کہ ... اصول تنقید کیا ہیں
تک ہمارے شعر و ادب پر قابل نقاد نے ... اور ان کے استعمال
میں احتیاط کی کمی گمراہیوں کے ارتکاب تک پہنچا گئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی۔ پٹنہ | تنقید کے بنیادی اور اصلی سوالوں کا جواب تو کیا شعور بھی جناب کلیم الدین احمد کو
میسر نہیں ہے۔ چنانچہ وہ تنقید کے نام پر صرف ایک فریبی سے کام لیتے
ہیں اور اس پرزہ کاری پر طمطراق دکھاتے ہیں۔ کم علمی اور کم نظری
آدمی کے اندر کم ظرفی بھی پیدا کرتی ہے۔

"اقبال کی نظم میں صرف الفاظ، الفاظ، الفاظ ہیں"

گفتگو کا یہ ہسٹریائی انداز وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جس کے پاس کہنے
کو کچھ نہ ہو، کوئی کام کی کوئی پتے کی بات نہیں لہذا وہ صرف بکواس
کرتا ہے۔ اور چونکہ اسے احساس ہے کہ لوگ اس کی بکواس
پر کان نہیں دیں گے۔ لہذا چلانے لگتا ہے مگر گلا پھاڑنے سے ذرا
اور بھی زیادہ مسخرا نظر آنے لگتا ہے۔ اردو ادب سے اگر کلیم الدین
احمد کی تنقید کو نکال کر پھینک دیا جائے تو اردو ادب
کے کیف و کم میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔ قطع نظر ... ہوگا، بلکہ اتنا نقصان ہوگا۔

کھوٹے سکے سے پاک ہو جائے گا۔

ملٹن کے شیطان ہی کی طرح جناب کلیم الدین احمد کے
تنقیدی تصورات بھی [illegible] (اوٹ ڈیٹانگ) ہیں
انھیں بیسویں صدی کی روح تنقید سے تو کیا آشنائی ہوگی انیسویں
صدی کی بھی بہترین تنقیدی روایات کا ادراک نہیں، اور انکے سارے
تنقیدی مفروضے اٹھارہویں صدی کی ہیئت پرستار انگریزی تنقید سے
ماخوذ ہیں ــ جناب کلیم الدین احمد کی پہلی بنیادی اور سب سے بڑی
تنقیدی خامی یہ ہے کہ وہ اصناف ادب کی حدود کا کوئی لحاظ نہیں
کرتے اور نہ دنیا کے مختلف ادبوں میں اصناف کے امتیاز سے وہ واقف
ہیں اسی لئے غلط مبحث کرتے ہیں۔

شاعری اور تنقید شاعری سے لطف لینے کیلئے ذوق شعر اولین ہے جسکی
بیحد افسوسناک کمی جناب کلیم الدین احمد میں بداہتہً پائی جاتی ہے۔ ذوق ادب
کیساتھ ساتھ کومن سنس (حس مشترکہ) کی بھی کمی ہے اور تنقیدی معقولیت تو
سرے سے غائب ہی ہے ــ نیاز فتحپوری تنقید کے نام پر شوشہ بازی
کیا کرتے تھے اور شعراء کے کلام پر الٹی سیدھی اصلاحیں دیا کرتے تھے وہ بھلا
تو آج بھی شاعر کی حیثیت سے سمجھے جاتے ہیں جبکہ نیاز کو نقاد کی حیثیت سے
اب بہت کم رہ گئے ہیں جناب کلیم الدین احمد کی نیاز فتحپوریت کا حشر
کیا ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ اگر دھیات سے انکی کتابیں نکال دی جائیں تو زیادہ
سے زیادہ دس ــ بیس سال کے اندر وہ آثار قدیمہ بن کر دیکھ عجائب خانے یا اسی
جیسی جگہ پر پہنچ جاتا ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالحق | کلیم الدین احمد کا مطالعہ اور نظر وسیع ہے۔
انہوں نے مغربی ادب کا مطالعہ گہری نظر سے کیا
ہے لیکن وہ مغرب کے اثر سے اس قدر مغلوب ہیں کہ بعض اوقات حد
سے تجاوز کر جاتے ہیں اور مضحکہ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی لئے
بے رو و رعایت بڑی آزادی اور بے باکی سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی
کتاب اردو تنقید پر ایک نظر نے یہ تو کیا کہ ہجا رے ادیبوں کو ... ...
دیا اور وہ اپنے کاموں کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو گئے لیکن ان کی ...
یک طرفہ ہے [اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۲ ۱۹۸۱ء ص ۲۲۲]

ظ۔ انصاری پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کا میں قائل اور
اور مداح رہا ہوں۔ عقیدت مند نہیں۔ ان کے قلم
نے چونکا دیا۔ سوچنے پر مجبور کیا۔ ذوق نے تربیت نہ کی تاہم وہ پیش رو
ہیں موجودہ ناقدان اردو کے، اور ہم سب پر ان کا احسان ہے۔ انگریزی
ادب کی تنقید جدید کی جھلک ان کی تینوں کتابوں پر تیر رہی ہے۔

باقر مہدی صاحب نے ایک مضمون موصوف پر لکھا ہے وہ ملے تو
دریافت کیا کیسا ہے۔ کہنے لگے کہ ذرا سخت مضمون ہے۔ شاید لوگ پسند نہ کریں

شمس الرحمٰن فاروقی میں نے کلیم الدین صاحب سے بہت
کچھ سیکھا ہے لیکن ان سے اختلاف

میں لکھتا ہوں کلیم الدین صاحب پر لکھنا بڑے جوکھم کا کام ہے۔

شاہی رنجن بھٹاچاریہ | میں جناب کلیم الدین احمد صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات پر قلم اٹھانے کے لائق نہیں ہوں دراصل ان کے سلسلے میں مجھ جیسے آدمی کا کچھ لکھ دینا میرے خیال میں ان کی بے عزتی ہے۔ چونکہ جدید ادبی تنقید میں انہوں نے جو انقلاب برپا کیا ہے اس سے نئی نسل کے تمام فن کار متاثر رہے اور پرانے سوچنے والوں پر تو بجلی گر گئی۔ میرا تعلق نئی نسل کے لکھنے والوں میں ہے اور اس لحاظ سے میں ان کا احترام کرتا ہوں کہ ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں انہوں نے عظیم تبدیلیاں لائی ہیں اور جدید طرز پر ہم فن کے سلسلے میں سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔
جو شخص کا احترام کرتا ہو وہ کیوں کر اس پر قلم اٹھائے، شعوری یا غیر شعوری طور پر جذبۂ احترام کی چھاپ مضمون پر پڑیگی۔
کلیم صاحب پر قلم اٹھانے کا حق ان ہی کو ہے جو یا تو ان سے عمر میں بڑے ہوں، ہم عمر ہوں، ان کے ساتھی ہوں یا پھر اردو ادب میں جنکو بلند مقام مل چکا ہے۔ اور میں ان میں سے نہیں ہوں اگر میں کچھ لکھوں تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔

پروفیسر سلام سندیلوی | مجھے کلیم الدین صاحب سے زبردست

عقیدت ہے۔

ڈاکٹر گیان چند "اردو زبان اور فنِ داستاں گوئی" اردو داستانوں کے موضوع پر پہلی بھرپور تنقیدی کتاب ہے۔ کلیم الدین احمد نے طلسم ہوشربا کو نمونے کے طور پر پیش کیا۔ وہ جدید ناولوں سے کسی حد تک اور مختصر افسانوں سے بہت بڑی حد تک ناآسودہ ہیں جدید فکشن سے ان کی بے اطمینانی جتنی شدید ہے اسی تناسب معکوس سے وہ داستانوں پر والہ اور شیدا ہیں۔ ان کی تنقید انتہا پسندی میں رچی ہوئی ہے۔ اردو شاعری اور اردو تنقید پر انہوں نے سیاہ رنگ پوت دیا تھا تو اردو داستان کو اپنے ید بیضا کی چھوٹ سے منور کر دیا۔ وہ طلسم ہوش ربا کی سحر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ وہ اس کے آگے باغ و بہار جیسے شاہکار کے ذکر کو بد مذاقی سمجھتے ہیں۔ یہاں مجھے ان سے اختلاف ہے۔ فسانۂ عجائب کے ساتھ بھی وہ انصاف نہ کر سکے۔ پوری کتاب میں اگر ضرب کلیمی کا کوئی شکار ہوا ہے تو فسانۂ عجائب۔

پروفیسر عبدالمنان بیدل میرے ممتاز و معزز شاگردوں میں کلیم الدین احمد کا بیرنا و میرے

ہمیشہ ایک ہی طرح کا نیاز مندانہ اور مخلصانہ جس طرح وہ میرا احترام اس وقت کرتے تھے جب کالج کے سٹوڈنٹ تھے اور جب وہ ڈی۔ پی۔ آئی ہوئے۔ استادوں کے احترام کا جذبہ اقتدار و اختیار کے منصب پر پہنچنے کے بعد بھی کلیم سلمہٗ جیسے شریف النفس انسان میں ایک قائم ہے۔ جزاک اللہ

پروفیسر مسلم عظیم آبادی | کلیم الدین احمد اپنے زمانہ طالب علمی میں ایسے خاموش و بے زباں نظر آتے تھے کہ وہم و قیاس میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ آگے چل کر ایسے کامیاب استاد اور دلبر نقاد و مصنف ہوں گے کہ دنیائے ادب میں ان کے جھنڈے گڑ جائیں گے۔

حجیب ان کی فطرت میں تھی مگر انھوں نے اپنی اس کمزوری پر بڑی خوب صورتی سے قابو پالیا۔ ولایت سے واپس آکر کلاس میں لکچر دیتے تو وہ طلباء پر نظر کرنے کے عوض چھت میں ٹکٹکی لگائے رہتے۔ اور اسی طرح بہترین لکچر دے کر نکل جاتے۔

اپنی قوت ارادی کی نشوونما سے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو جس درجہ بیدار کیا وہ محیر العقول ہے۔

ہمیں دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ اگر کلچر گیا تو سب کچھ گیا۔ اسلئے
کہ پھر مسلمانوں کی کوئی انفرادیت نہیں رہے گی۔

(۳) یہ حقیقت اب عام ہو چلی ہے کہ اردو کے وجود کو نیست و نابود کر
دیا جائے اور اس کا کسی کو احساس بھی نہ ہو۔ اردو پر کروڑوں
روپے خرچ کئے جائیں لیکن اس طرح کہ اردو کو کوئی فائدہ نہ ہو
البتہ کچھ اردو لکھنے والوں کو فائدہ ہو جائے۔

(۴) اگر کسی درخت کے شاخ کو ہم زریں اور رنگیں پھولوں سے آراستہ
کریں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بیخ کنی بھی کرتے جائیں تو نتیجہ معلوم۔ اسلئے
اردو پڑھنے اور پڑھانے کے انتظام کو اولیت ملنی چاہئے۔ اگر یہ
اولیت نہ ملی، اگر پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں مسلمان بچوں کو
اردو پڑھانے کا مناسب انتظام نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں کہ
مسلمان اپنے کلچر سے بھی سراسر ناآشنا ہو جائیں۔

(۵) آج اردو ادب کی باگ ڈور پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ پڑھے
لکھے لوگوں سے میری مراد ان سے ہے جو اردو فارسی، عربی کے علاوہ
بھی کسی اور زبان و ادب سے واقف ہیں۔ سیاسی اسباب کی وجہ
سے یہ واقفیت زیادہ تر انگریزی زبان و ادب سے ہے اور انگریزی
کے ذریعہ سے کچھ اور زبانوں کے لٹریچر سے بھی واقفیت ہو گئی ہے۔

(۶) ہمارے ساتھ یہ اہم مسئلہ درپیش ہے کہ وہ ساری کتابیں جو اردو میں لکھی جارہی ہیں وہ طبعزاد ہوں یا ترجمہ کی شکل میں ان کے پڑھنے والے کچھ دنوں کے بعد شاید تلاش کرنے پر بھی نہ ملیں۔

(۷) جن کی مادری زبان اردو ہے ان کے بچے اب اردو نہیں پڑھتے کچھ اسلئے کہ اب اردو پڑھنے سے کسی معاشی فائدے کی گنجائش نہیں لیکن زیادہ اسلئے کہ اردو پڑھنے کیلئے جو سہولتیں تھیں وہ اب تیزی سے ختم ہوتی جارہی ہیں۔

(۸) یوں تو لکھنے کیلئے اردو کیلئے سب کچھ کیا جارہا ہے۔ ترقی اردو بورڈ بھی ہے جس کی اٹھارہ یا اکیس کمیٹیاں کام کررہی ہیں۔ اصطلاحات کے ترتیب ہو رہے ہیں معیاری کتابوں کا انگریزی سے اردو ترجمہ بھی ہو رہا ہے، کافی پیسے بھی خرچ ہو رہے ہیں، اور محنت بھی صرف ہو رہی ہے لیکن ہم سوچتے ہیں کہ ان کتابوں کے پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے۔

(۹) یو پی اور بہار میں اردو اکادمیاں بھی قائم ہو گئی ہیں اور ممکن ہے کہ اسی طرح کی اور بھی اکادمیاں قائم ہو جائیں گی۔ یہ بات تو بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے کہ اردو ادیبوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ ان کو وظیفے دیئے جائیں اور ان کی کتابوں کی اشاعت کیلئے کچھ لوگوں کو فائدہ تو ضرور ہوگا لیکن پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ انہیں پڑھنے

بیان کئے جاتے ہیں تو اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اردو انشاء پرداز ان نقائص سے شناسائی حاصل کریں اور اس سے بچ کر ایک بہتر ادب کی تخلیق میں منہمک ہو جائیں۔ اگر کوئی شخص بھٹک رہا ہو تو اسے صحیح راستہ بتانا اخلاقی فرض ہے، نہ یہ کہ اسے بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا جائے۔

(۱۷) فن کار تلامیذ الرحمٰن نہیں اور نہ وجدان اس کے فن کا روح رواں۔ مضامین غیب سے خیال میں نہیں آتے اور نہ صریر خامہ نوائے سروش ہے۔ جہاں آسمانی وجدان کی بات صحیح نہیں اسی طرح غیر شعوری وجدان بھی غلط ہے۔ مضامین شعور کی زد میں آتے ہیں اور شعور انہیں فنی تقاضوں کے مطابق تراش خراش کر کے فنی کارنامے کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

(۱۸) اردو داستانوں کا سرمایہ کسی دوسری زبان کی داستانوں کے مقابلے میں بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی دوسری زبان کے مقابلے میں ہیچ نہیں لیکن یہ تو اردو دنیا کا شیوہ ہے کہ اچھی چیزوں سے

واقفیت نہیں، اور کم قیمت کی چیزوں کی تشہیر کی جاتی ہے۔

(۱۹) اردو میں افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں داستانوں کا زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ ہماری ناسمجھی اور لاعلمی ہے کہ ہم اس قیمتی سرمایہ کی قدر و قیمت سے بالکل واقف نہیں اور اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور کم قیمت افسانوں اور غزلوں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

(۲۰) "طلسم ہوش ربا" معمولی کھانا نہیں ایک عظیم الشان دعوت ہے شاہانِ جہاں کے لائق۔ یہاں ہر چیز کی افراط ہے۔ کسی قسم کی کمی نہیں پھر یہ دعوت چند خوش قسمت لوگوں کیلئے نہیں بلکہ یہ دعوت عام ہے۔

طلسم ہوش ربا میں جو معنی خیزی ہے وہ اردو ناولوں یا افسانوں میں کہیں نہیں ملتی۔

(۲۱) "داستانِ امیر حمزہ" اور "بوستانِ خیال" عظیم الشان داستانیں ہیں۔ ان کے بعد مختصر داستانوں کا ذکر ایک قسم کی بدمذاقی ہے۔

(۲۲) اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تو وہی کر سکتا ہے جو عالمی ادب کے بارے میں کچھ جانتا

واقفیت ہو۔ علم کے گل حسن بہت ہیں اور تنقید کا دامن تنگ نہیں لیکن دونوں ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ جو کبھی کبھی صبح کی حسین پتیوں میں زہریلے کیڑے بھی چھپے رہتے ہیں۔ اس سے پرہیز لازم ہے۔

(۲۵) شعر میں لفظوں کی اہمیت کیا ہے اسے پوری طرح سمجھنے کیلئے دو متضاد حقیقتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک بات تو یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ لفظوں کی کوئی ایسی ادبی خصوصیت نہیں ہوتی وہ نہ تو حسین ہوتے ہیں اور نہ ہی بدصورت۔ نہ یہ خوشگوار ہوتے ہیں اور نہ ملول۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شعری لفظ اور نثری لفظ میں فرق ہوتا ہے۔ آسمان زمین کا فرق ہوتا ہے۔ نثری لفظ چپٹا اور سفید ہوتا ہے۔ اسے دوسری طرح سے بھی کام میں لایا جاسکتا ہے۔ لیکن شعری لفظ آپ اپنا وجود رکھتا ہے۔ اور ایک دنیائے معانی اسمیں پنہاں ہوتی ہے۔ پھر ہر لفظ کا ایک پیکر ہوتا ہے۔ اسے بولتے ہیں تو اس کی ساخت ہم منہ میں محسوس کرتے ہیں۔ سنتے ہیں تو ایک خاص پیکر کا احساس ہوتا ہے۔ سوچتے ہیں تو آنکھوں کو، اندرونی آنکھوں کو، ان کا

صوری پیکر نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر لفظ کا ایک پیکر
ہوتا ہے اور یہ پیکر کئی پیکروں سے مل کر بنتا ہے۔
اس کی مختلف کیفیتوں کو اپنے حواس خمسہ کی مدد سے
ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ مرئی بھی اور صوتی بھی۔ اسے ہم
چھو سکتے اور سونگھ بھی سکتے ہیں اور زبان و لب سے
اس کی ساخت کا لطف بھی اٹھا سکتے ہیں۔

(٢٦) اردو میں تنقید سے مراد تعریف ہے، تحسین ہے، تقریظ ہے اور کبھی
کبھار تری تنقیص، بیجا نکتہ چینی، بے حاصل خردہ گیری ہے۔
تنقید ایک قسم کی پرکھ ہے ایک قسم کی کسوٹی ہے جس سے کھرے
کھوٹے میں امتیاز کرنا ممکن ہے۔ یہ تنقید نہیں کہ ہم کسی شاعر
کی مبالغہ آمیز، صحت سے دور تعریف کریں اور اسمیں زمین
آسمان کے قلابے ملا دیں۔
تنقید یہ ہے کہ ہم کسی شاعر کی خوبیوں، خامیوں اور حدود
سمجھ کر واضح طور پر بے کم و کاست بیان کریں۔ اگر ہم
ان کی خوبیوں کو اچھالیں اور ان کی خامیوں سے چشم پوشی
کریں تو یہ تنقید ہی بد دیانتی ہوگی لیکن اردو میں اس
بد دیانتی یعنی خوبیوں کو اچھالنا اور خامیوں پر پردہ

ڈالنا۔ اسی بد دیانتی کو اصل تنقید سمجھا جاتا ہے۔

(۲۷) اردو میں خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست پر عمل کیا جاتا ہے اور شعرا کا شمار بزرگوں میں ہے اس نے ان کی خطاؤں کی پردہ داری اصل ایمان ہے لیکن خطا بزرگوں سے ... ہو تو بھی خطا ہے اور چھوٹوں سے خطا ہو تو بھی خطا ہے۔

اروئے اخلاق خطا پوشی اچھی بات ہو اور خطا بینی بری لیکن تنقید میں خطا پوشی اصل ایمان ... بلکہ ایک قسم کا گناہ ہے اور خطا بینی کی ضرورت آپڑتی ہے۔ البتہ اگر اچھائی سے چشم پوشی کی جائے یا اچھائی کو برائی بنا کر پیش کیا جائے تو وہ گناہ ہے

مشرقی افتاد طبیعت بت گیری اور بت پرستی کی طرف مائل ہے اسی افتاد طبیعت کی وجہ سے ہم اپنے شعرا کی پوجا کرتے ہیں اور شعرا ہمارے لئے دیوتاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ کوئی اپنے دیوتاؤں پر نکتہ چینی برداشت نہیں کرے گا

(۲۸) وزن کی شعر میں زیادہ اہمیت نہیں ہے جو چیز اہم ہے وہ لفظوں کی موج خرام ہے۔ لفظوں کا چلتا لہجہ

جلوس ہے۔ انگریزی میں اسے Rhythm کہتے
ہیں (یعنی آہنگ) آہنگ کے بعد ٹون کی بات آتی ہے
انگریزی میں ایک لفظ ہے Tone اور ٹون
میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ [illegible] ان
باتوں کو سمجھا ہوتا ہے ان کی جانچ [illegible] ضروری
ہوتی ہے۔ اگر یہ [illegible] پیش نظر نہ ہوں تو [illegible]
نظم کی قدر و قیمت صحیح نہیں [illegible]۔

نقاد کی حیثیت ایک جج [illegible] کی ہے اسے یہ
فیصلہ کرنا ہے کہ یہ نظم اچھی ہے، وہ نظم بری ہے اور
اسے اس فرض سے گریز ممکن نہیں۔ یہ نظم اچھی ہے
اور وہ نظم بھی بری نہیں کہنا [illegible]
ہے کہ اگر کوئی اصول نہ ہو کوئی Norm نہ ہو تو نتیجہ
Chaos ہے۔

(۲۹) نقاد کا فرض ہے کہ وہ سماجی اور شخصی حالات و شاعری
دنیا کو تباہ ہونے سے بچائے۔ ہر وہ شئے جو مفید اور
آسودگی بخش طرز زندگی کے حصول میں حائل ہو اسے
ہٹانے کی کوشش نقاد کا فرض ہے۔ نقاد ایک قسم کا طبیب بھی ہے۔

شعراء وادباء کلیم الدین کی نظر میں

نظیر اکبر آبادی اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبر آبادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے۔ نظیر کا وجود ہی اردو شاعری کی بے نظیر تنقید ہے نظیر نے غزل میں نئی راہیں نکالیں ان میں نئی وسعتیں پیدا کیں۔ اسمیں نظم کی خوبیاں داخل کیں۔ غزل میں بھی ایک مسلسل تجربے کا بیان ممکن ہے۔ اور نظیر نے مسلسل تجربے کا بیان ایسی غزلوں میں کیا ہے۔ نظیر غزل میں الکیر کے فقیر نہ تھے۔ اور بندھے ٹکے مضامین کی مروجہ رنگ میں تقلید نہ کی۔ غزل کے میدان میں نظیر کی حیثیت مجتہد کی ہے ـــــ اردو شعراء لفظوں کے الٹ پھیر کو شاعری سمجھتے رہے ہیں۔ نظیر کا زاویہ نظر جداگانہ ہے۔ وہ کبھی یہ غلطی نہیں کرتے کہ زبان کی فصاحت اور پاکیزگی کے موہوم حسن پر اپنے تجربوں کی لطافت کو نثار کردیں۔

نظیر نے جتنے لفظوں کا استعمال کیا ہے، اردو کے کسی شاعر نے نہیں کیا۔ یہ بات بھی نظیر کی شاعرانہ عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ الفاظ خلا میں سانس نہیں لیتے، ہر لفظ احساسات و خیالات کی ایک دنیا ہوتا ہے، اور

چھا شاعر لفظوں کی گنجائش سے مصرف لیتا ہے۔ نظیر نے اپنی الگ زبان ایجاد کی ہے۔ تعجب ہے کہ نظیر کی شاعری کی طرف سے عموماً بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اور بہت کم لوگوں نے ان کی شاعری کے محاسن کو سمجھا اور ان کا اعتراف کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو میں زبان کو شاعری پر ہمیشہ ترجیح دی گئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ نظیر کے شعر زبان کی معیار پہ پورے نہیں اترتے۔

اردو شعراء زبان کو بت بنا کر اس کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اردو شاعری میں بہت سی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ زبان کوئی اچھوتی حسین دیوی نہیں جس کی پوجا کی جائے۔ یہ تو صرف ایک ذریعہ ایک آلہ ہے جس سے جذبات و خیالات کی ترجمانی ممکن ہے۔

اقبال

اقبال شاعر تھے اچھے شاعر تھے اور وہ زیادہ اچھے شاعر ہو سکتے تھے اگر وہ شاعر ہونے پر قناعت کرتے۔ اور پیغمبر ہونے پر مُصر نہ ہوتے۔ اس پیغمبری نے ان کی شاعری پر ایک ضرب کاری لگائی لیکن اس کاری ضرب کے بعد بھی ان کی شاعری باقی رہی اور یہ ان کی شعری جانداری کا ثبوت ہے۔

اقبال اکثر اچھے اچھے اشعار لکھتے ہیں۔ شاید انہیں اس بات کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ انہوں نے اچھے اشعار لکھے ہیں۔ وہ ان شعروں کو جلد

پس پشت ڈال دیتے ہیں اور اپنے خیالات سے الجھ جاتے ہیں۔

اقبال کی بعض نظمیں جوشیلے نغمے ہیں، جن میں روانی، تازگی، گھلاوٹ شیرینی، شعریت اور خیالات سب ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا ایک قسم کی بد مذاقی ہے۔

اقبال کا طرز جداگانہ ہے۔ انھوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے اردو میں ان کی غزلیں بڑا کارنامہ ہیں۔ اسی طرح ان کی فارسی غزلیں بھی ایک بڑا کارنامہ ہیں، کیوں کہ انھوں نے غزل کو نئے خیالات دیئے نئی آواز دی اور اپنے خیالات کے لئے موزوں و مناسب طرز بھی اختیار کیا۔ اقبال کی بزرگی یہی ہے کہ انھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ اپنا جہان شاعری آپ پیدا کیا، جیسا کہ انھوں نے کہا ہے "اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے" ــــــ وہ زندوں میں تھے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

"ساقی نامہ" اقبال کی بہترین اردو نظم ہے۔ یہ روایتی قسم کا ساقی نامہ نہیں۔ عنوان پرانا ہے لیکن خیالات نئے ہیں۔ اور پرانی بوتل میں نئی شراب بھری ہوئی ہے۔ "خضر راہ" اور "ذوق شوق" کی طرح یہاں بھی ایک حسین پس منظر ہے۔ جو صرف حسین ہی نہیں معنی خیز بھی ہے۔

"ساقی نامہ" ایک بہت ہی لطیف، پیچیدہ، رنگین، توانا نظم ہے، اور

اس میں نقوش و آہنگ کی ایک ایسی فن کارانہ گونج ہے جو ان نظموں میں ناپید ہے۔

دانتے کی ڈیوائن کومیڈی کے مقابلہ میں جاوید نامہ ایک نفس کا تیار شدہ معلوم ہوتا ہے۔ نظریہ میں ... صورت کی کمی ہے۔ طلوع اسلام میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ یہ بات نظم شاعری نہیں شروع سے آخر تک خطیبانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسٹیج پر کھڑے ہیں اور ان کا مقصد سامعین کے جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے۔

دانتے کا تخیل ایک ... اور اس سے مقابلہ میں اقبال کا تخیل ایک جوئے کم آب ہے۔ ملٹن رزمیہ نگار ہے۔ اقبال کو رزمیہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

آل احمد سرور سرور صاحب سے مجھے بہت امیدیں تھیں اور اب بھی ہیں لیکن اب یہ کچھ سلسلہ سی ہو گئی ہیں۔ سرور صاحب ایک سانس میں "ہاں" "نہیں" کہتے جاتے ہیں۔ شاید یہ انصاف معقولیت اور توازن کا نتیجہ ہے۔

ہاں	نہیں
۱۔ اردو شاعری کا شاہکار غزل ہے	۱۔ غزل شاعری کی معراج نہیں۔
۲۔ غزل محبت کی داستان ہے۔	۲۔ طاؤس و رباب کے ساتھ شمشیر

ہاں

غزل کی بہترین قسم عاشقانہ ہے۔ عاشقانہ شاعری کیلئے بہت موزوں ہے۔

۲۔ ہلکے پھلکے لطیف جذبات کے اظہار کا اچھا ذریعہ ہے۔

۳۔ اس کا آرٹ تلوار کی دھار کا آرٹ ہے۔ چاول پر قل ھو اللہ لکھنے اور نقش نگینے کا فن ہے۔ نقاب پوش آرٹ ہے۔

۵۔ بڑی بلاغت کے ساتھ اچھے اچھے خیالات ادا کر سکتی ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کر سکتی ہے

نہیں

ستاں کے بھی حسن کو ملحوظ رکھنا چاہئے
غزل چند محدود خیالات کے الٹ پھیر کو کمال زندگی سمجھتی ہے۔

۳۔ روح کی پیاس پوری طرح نہیں بجھا سکتی۔ سارے درد کا درماں نہیں ہے۔

۴۔ اسکی ریزہ خیالی اشاروں میں بات کرتا ہے۔ نظم کے پلاٹ ترکیب اور ارتقائے خیال کو نہیں جانتا شاعر نہ مسلسل سوچ سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے۔ گویائی سلب ہو گئی ہے۔

۵۔ تفصیل، وضاحت اور تعمیر کے حسن سے بالکل مس نہیں مسلسل خیالات وضاحت کا بھی ایک حسن ہے۔

ظاہر ہے کہ سرور صاحب بھی وہی کہتے ہیں جو میں کہتا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کے دور میں بھی وہ پھاوڑے کو

چاؤڑ کہنا نہیں چاہتے۔

سرور صاحب نے اصولی باتیں کیں لیکن تنقید کے اصول کی ترتیب نہیں دی ـــ ـــ نظریہ کی اہمیت پر زور دیا۔ گو کوئی نظریہ پیش نہیں کیا۔ حالی سے زیادہ واقفیت رکھتے ہوئے بھی اپنی واقفیت سے کوئی خاص کام نہیں لیا۔ سرور صاحب غور و فکر کرتے ہیں مگر غور و فکر سے سر میں درد ہونے لگتا ہے

! سرور صاحب پڑھے۔ با صلاحیت

آدمی ہیں۔ اگر وہ اپنی صلاحیت سے جائز صرف لیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں

شوق قدوائی ! شوق میں ڈرامہ نگاری کی قوت کی کمی تھی کوائف کا بیان تو وہ کرتے ہیں اور اپنے مخصوص رنگ اپنے میدان میں خوب کرتے ہیں۔ لیکن سیرت نگاری ان کے بس کی بات نہیں۔ انکا منظوم ڈراما "قاسم و زہرہ" دیکھئے تو یہ بات واضح ہو جائے گی۔ سیرت نگاری کا سرے سے وجود ہی نہیں۔

شوق کی زبان پاکیزہ اور سلیس ہے۔ بندشیں نفیس۔ الفاظ، محاورے چست بیانات سادہ اور دل آویز ہیں۔ جذبات و خیالات کی فراوانی ہے لیکن یہ سارے اوصاف بھی ان کے اصل عیب کو چھپا نہیں سکتے۔

نسوانی جذبات کو شوق حسن کارانہ خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ اور

یہی ان کی انفرادی خصوصیت ہے ـــــ اگر ان کی بصیرت تیز اور گہری ہوتی اگر وہ دل کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرتے تو وہ بلند پایہ شاعر ہو سکتے تھے۔ یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے اردو میں ایک نئی عمارت کی داغ بیل ڈالی۔ اس وجہ سے شعور کی جدت طرازی خاص اہمیت رکھتی ہے

حالی۔ حالی کی کائنات ان کا مسدس ہے یوں کہنے کو انہوں نے غزلیں بھی لکھیں اور مختصر اخلاقی قطعے اور تضمیں بھی لیکن ان کی شہرت کا سبب یہی مسدس ہے۔ حالی کی شاعری میں کوئی حسن نہیں، بات یہ ہے کہ گرد و پیش کے واقعات پر کچھ لکھنے سے شاعر کی اہمیت نہیں بڑھتی۔ کہنا پڑتا ہے کہ آزاد کی طرح حالی بھی اوسط درجے کا دماغ رکھتے تھے۔ ان کے خیالات بھی سطحی ہیں۔ کچھ بھی بلند پروازی یا گہرائی نہیں ہے۔ ان کا طرز ادا آزاد سے کچھ زیادہ سادہ اور بے رنگ ہے۔ نثریت اسقدر غالب ہے کہ اگر وزن کا خیال نہ کیا جائے تو ان کے شعروں کو شعر سمجھنا مشکل ہو جائے۔

حالی کے خیالات بھی معمولی ہیں اور بیان کا اسلوب بھی معمولی ہے۔ ان کے نظم کی تاریخی اہمیت مسلم ہے لیکن جس شاعر کا زمانہ منتظر تھا جس آزاد خیال مجدد و بلند پایہ شاعر کی ضرورت تھی وہ حالی نہ تھے۔ حالی شاعر نہ تھے۔ ان کا تخیل نارسا تھا قوت حاسہ کم تھی اتنی کم تھی جیسے تھی ہی نہیں۔ ذہن و ادراک میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ احساسات شاعرانہ نہ تھے۔ طرز ادا میں خشکی تھی یکسانی تھی۔ اور بے رنگی بھی۔ ہاں نثر میں جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ حالی کی نظم میں بھی کبھی کبھی مل جاتی ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی

جوش کی شاعری عصرِ حاضر کی فضا میں سانس لیتی ہے۔ وہ شاعری کو پیغمبری کا جزو سمجھتے ہیں۔ اور پیغمبری کے معنی یہاں صرف چیخ پکار۔ آج ہندستان پیغمبروں سے بھرا پڑا ہے۔ کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ وقتی چیز ہے۔ بیداری کے بعد یہ چیخ پکار مہمل ہو جاتی ہے۔ یہ ہنگامی چیز ہے۔ جوش کی انقلابی نظموں میں یہی وقتی اور سطحی باتیں ہیں۔ یہ چیخ پکار ہے، زور ہے، تعمیریت نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ خطابت کا بھی شاعری میں جگہ ہے بشرطیکہ وہ شاعرانہ حدود کے اندر رہے۔ جوش کی نظموں میں خطابت شاعرانہ حدود میں نہیں رہتی اور فنی حسن نہیں بنتا۔ جوش لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ اور اس کھیل میں ایک قسم کی لذتیت محسوس کرتے ہیں۔

نظموں میں جوش جزئیات کے حسن میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ تصویر صاف نہیں دکھائی دیتی۔ نظم کے علاوہ غزلیں ہیں طوالت، قافیہ پیمائی، اچھوتے اور نادر تشبیہ اور استعارے، تخئیل کے پھیلاوے، معنی آفرینیاں یہ سب چیزیں ہیں۔ لفظ کی زیادتی، باتوں کی کمی چھپا نہیں سکتی۔ جوش کے ملتے ہوئے

افکار تخئیلی تجربے نہیں بنتے افکار گویا ایک طرف رہتے ہیں اور الفاظ دوسری طرف۔ بات یہ ہے کہ جوش الفاظ کے جادوگر نہیں بلکہ بازی گر ہیں۔

لفظوں کی بازی گری اور شاعری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جوش نے اپنی نظم میں بات ٹھیک ہی کہی ہے۔
"بس یہی چھوٹی سی باتیں بس یہی اوچھے سے رنگ" اور وجہ بھی ٹھیک بتائی ہے ؂

ایک طفلانہ باورِ غ ایک کھوکھلا حسن شعور

اکبر الہ آبادی اکبر کی شاعری ان کے عہد اور ان کے ماحول کا آئینہ ہے۔ وہ مختصر پیمانے میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو تیر بہ ہدف ہوتی ہیں۔ وہ کیسے ایسے شعر تراشتے ہیں جو نشتر کی طرح دلوں میں چبھتے ہیں۔ وہ ان شعروں کے تراشنے میں کاوش سے صرف لیتے ہیں اور جاں فشانی کے ساتھ ان کی جلا، تیزی، کاٹ کو حدِ کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ اشعار دماغ میں ہیجان پیدا کرتے ہیں اور ایک وسیع منظر سامنے لا کھڑا کر دیتے ہیں، اور پڑھنے والا اس منظر کے پھیلتے ہوئے دامن میں گم ہو جاتا ہے۔

اکبر کی یہ خامی نہیں کہ وہ رجعت پسند تھے یا تصور پرست تھے یا ان کے خیالات میں تضاد تھا۔ ان کی کمی یہ ہے کہ انکا آرٹ بہت محدود قسم کا تھا اور یہ کمی کچھ اکبر کی مخصوص کمی نہیں۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ اردو شاعروں میں پائی جاتی ہے۔

اصغر گونڈوی

اصغر کے اشعار میں ایک سماوی شان ہے اور خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ ہمالہ کی برف آلود سر بہ فلک چوٹیوں کی خوبصورتی کے مانند جب سورج کی شعاعیں ان پر طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کرتی ہیں۔ اس خوب صورتی کا سطح زمین پر کھڑے ہو کر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے قاری کو خود بھی اونچا اٹھنا پڑتا ہے۔ اصغر کے اشعار میں کہیں بھی زندگی کی گرمی تپش اور عمل نظر آتی ہے۔

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی صاحب نے یوں تو تنقیدی مضامین میں بھی بڑی خیال انگیز باتیں کہی ہیں مگر دراصل وہ ایک مزاح نگار، طنز نگار اور انشاء پرداز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ جو ڈھونڈے دل سے سمجھ بوجھ کر ادب اور ادبی مسائل پر لکھتے ہیں۔ جو سنجیدگی اور متانت کا برابر خیال رکھتے ہیں۔ جو نئی تحریک نئے خیال کی کورانہ تقلید نہیں کرتے رشید احمد صاحب ایسے ہی لوگوں میں ہیں۔ وہ بھی محدود مشرقی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ وسعت نظر آزادیٔ فکر، غیر معمولی بصیرت، تیز ادراک کی نمایاں کمی ہے۔ ان کی طبیعت میں ایک قسم کی کج روی ہے جو ان کی ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔

عظیم بیگ چغتائی ان کی ذہنیت ایک ایسے طالب علم کی ہے جس نے ابھی بی۔اے نہیں کیا ہے۔ شخصیت اوسط درجہ کی ہے۔ عاشر اور محیط دماغ کا پتا نہیں۔ نظر سطحی چیزوں پر پڑتی ہے۔ گہری بصیرت اور باریک بینی کا وجود نہیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں سے طلباء ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ ان میں قوت ایجاد کی نمایاں کمی ہے۔ ایک افسانہ پڑھ لیجئے پھر کسی دوسرے افسانوں کو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ چغتائی ظرافت کے صحیح معنوں سے بھی واقف نہیں۔ ان کی دنیا بھی بہت تنگ ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق ڈاکٹر عبدالحق مغربی اثرات کے تحت اپنی تنقید نہیں لکھتے اور مغربی خیالات کو سمجھنا اچھے برے میں تمیز کرنا پھر ان سے منفصل باتوں کا انتخاب کرنا۔ یہ سب ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ اپنے جلد اوصاف کے باوجود بھی نقاد کی حیثیت سے حالی کے مرتبہ تک نہیں پہنچتے۔ انہوں نے نہ تو بنیادی چیزوں پر کوئی روشنی ڈالی اور نہ آلۂ تنقید پر مزید جلا کی۔

اردو میں غالباً سب سے پہلے عبدالحق صاحب نے کچھ فن تنقید کی اہمیت کو سمجھا اور اسے خامیوں سے پاک کرنے کی کوشش کی اسی وجہ سے ان کے تبصرے دوسروں کے تبصرے سے بہتر ہوتے تھے۔ ان میں غیر جانب دارانہ رائے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی

احتشام حسین احتشام حسین صاحب اصول نقد معین نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ ان کی ہر بات اشتراکیت پر ٹوٹتی ہے۔ کاش وہ مغربی ادیبوں کے تنقیدی خیالات اور ادبی تجربات سے فائدہ اٹھاتے، ان نقاد اور متضاد نقطۂ نظر رکھنے والوں سے اپنے کام کے خیالات چن لیتے، یہ مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے، اور احتشام صاحب اس کے اہل نہیں وہ مارکسیت کے تاریک کمرے میں چکر کاٹتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی ساری دنیا ہے۔

شبلی نعمانی شبلی نے بعض بنیادی مسئلوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اور مشرقی و مغربی نقادوں سے استفادہ کیا۔ حالی نے پرانی تنقید سے الگ ہو کر نئی تنقید کی ابتدا کی۔ شبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق نظر آتے ہیں۔

محمد حسین آزاد آزاد میں نقد کا مادہ مطلق نہ تھا۔ نظر مشرقی محدود تھی پابند تھی۔ وہ لکیر کے فقیر تھے، باریک بینی اور آزاد خیالی سے مبرا، انگریزی لالٹین کی روشنی ان کے دماغ تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ ان کی رائیں اکثر لوں ہوتی تھیں۔

ابوالکلام آزاد | آزاد اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ ان میں وہ شئے موجود ہے جو دوسرے رہروان راہ طنزیات میں مطلق نہیں۔ ہوں نے طبیعت حساس پائی ہے۔ وہ صرف حس ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے احساسات شدید ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات اپنے لگتے ہیں۔ ان کے خیالات میں بلا کا طوفان امڈا ہوتا ہے ان جذبات و خیالات اور ان کی شدت سے وہ خود بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری | بجنوری یورپ زدگی کا خود بھی ثبوت دیتے ہیں، اور کوتاہ نظری کا مرتکب ہو کر شاعری، تنقید حقیقت، مذاق سلیم، سمجھ بوجھ بر دانستہ ظلم کرتے ہیں۔
گیٹے کا مقام اسقدر رکین نہیں جیسا کہ بجنوری مرحوم سمجھتے ہیں اس کے علاوہ غالب ایک مبتذل صنف شاعری یعنی غزل میں لکھتے رہے اسلئے شاعر کی حیثیت سے ان کا مقابلہ والنٹے شکسپیر سے کرنا اپنی کم فہمی کا ثبوت پیش کرنا ہے۔

عبدالحئی مصنف گل رعنا | آب حیات کا اثر بعد کی تنقیدی کتابوں میں صاف نظر آتا ہے۔
گل رعنا بھی اس اثر سے آزاد نہیں۔ ظاہر ہے کہ مصنف

گل رعنا نے آب حیات کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ گل رعنا میں تنقیدی حصہ کالعدم ہے۔ واقعہ نگاری اور انشا پردازی میں یہ کتاب آب حیات کے گرد کو نہیں پہنچی۔ گل رعنا گر نہ لکھی گئی ہوتی تو بہتر تھا۔ اس کتاب کی تنقیدی اور ادبی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں۔

عبدالسلام مصنف شعر الہند | عبدالسلام صاحب کو تذکروں کی خامیوں کا احساس تھا اسلئے امید ہوتی تھی کہ وہ اپنی تصنیف میں ان خامیوں اور نقائص کو داخل نہ ہونے دیں گے لیکن شعر الہند کا پہلا حصہ آب حیات اور گل رعنا سے مختلف نہیں۔ دلچسپی میں یہ آب حیات سے بہت پیچھے ہے۔ یہ درست ہے اس میں مواد گل رعنا سے زیادہ ہے۔ لیکن گل رعنا پڑھی جاسکتی ہے شعر الہند کی ورق گردانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ میں نے بہت غور کیا مگر مجھے شعر الہند کی تالیف کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ان کو شعر و شاعری سے کوئی مناسبت نہیں۔ ان کی طبیعت خشک و بے رنگ ہے۔ تعجب ہے کہ شعر الہند مقدمہ شعر و شاعری کے بعد لکھی گئی لیکن مصنف نے اس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں کیا۔

آل احمد سرور

کلیم الدین احمد بحیثیت نقّاد

پروفیسر کلیم الدین احمد ہمارے چوٹی کے نقادوں میں سے ہیں۔ میں انہیں ایک بہت اہم نقاد ہی نہیں، تنقید کا ایک بہت ہی اچھا معلم بھی سمجھتا ہوں۔ نقاد کا کام صرف بت گری نہیں بت شکنی بھی ہے۔ اور کلیم الدین احمد نے بہت سے بت توڑے ہیں۔ ان کی کتابوں میں "اردو شاعری پر ایک نظر" فن داستان گوئی، اردو تنقید پر ایک نظر، اور عملی تنقید، بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ تنقید کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اور سانس لینے کی طرح اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ تنقید کو ایک سنجیدہ اور اعلا درجے کا فن قرار دیتے ہیں۔ جس کا درجہ کسی طرح تخلیق سے کم نہیں کیوں کہ اچھی تخلیق ایک تنقیدی صلاحیت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ کلیم الدین احمد کے سامنے عالمی ادب کے معیار ہیں اور وہ انہیں معیاروں سے اردو ادب کو پرکھتے ہیں

کیوں کہ ان کے نزدیک افکار اور خیالات ساری دنیا کی
ملکیت ہوتے ہیں۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی ادبیات پر
گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور اردو کے علاوہ فارسی اور عربی ادب
پر بھی وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ صاف اور دو ٹوک باتیں کہتے
ہیں۔ ان کی تحریریں واضح اور مدلل ہوتی ہیں۔ اور وہ بکثرت
مثالوں سے اپنی رائے کو مضبوط کرتے ہیں۔ الیف۔ آر
لیوس کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں ادب
کے معیاروں کے معاملے میں ایک سخت گیری ملتی ہے۔
جو مجموعی طور پر صحت مند ہے۔ انہوں نے مشرقی مزاج
مشرقی ماحول، ہندستان کی تاریخ، تہذیب اور مشرقی
روایات کی اہمیت کو بعض اوقات نظر انداز کرکے
صرف مغربی معیاروں کی بنا پر فیصلے صادر کئے ہیں۔ جن
سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ انہوں نے جن معیاروں کی روشنی میں اردو
ادب کے جن مختلف اصناف کو پرکھا ہے اور اردو ادب
کی خصوصیات کا جس خلوص اور دقتِ نظر سے جائزہ لیا
ہے اس کی بڑی ضرورت تھی۔

کلیم الدین احمد صاحب کے غزل کے متعلق خیالات
میں انتہا پسندی ہے۔ غزل کا ایجاز و اختصار، اس کی
دریا کو کوزے میں سمیٹ لینے کی صفت ہے۔ اس
کی ماورائے سخن بات، اس کی بلاغت، اس کے رموز وایما
میں اور اس کی علامات میں گنجینۂ معنی کے طلسمات، یہ
ایسی چیزیں نہیں ہیں جنہیں یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔
مگر اردو شاعری کو محض غزل کے فن کی روشنی میں دیکھنے
اور غزل کو خلاصۂ کائنات سمجھنے سے نہ تو اردو شاعری
کے پورے سرمایہ کے ساتھ انصاف ہوتا ہے اور نہ
اردو ادب میں گذشتہ پونے دو سو سال سے جو اضافے
ہوئے ہیں ان کی معنویت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔
کلیم الدین احمد کی تنقید ہمارے افق ذہنی کو وسیع
کرتی ہے۔ ہمیں طرف داری کے بجائے سخن فہمی کے
آداب سکھاتی ہے۔ اور ادب کی مخصوص بصیرت، اسکی تنظیم
اس کے حسن، اسکی اعلا سنجیدگی، اس کی قدروں کی تلاش اور
زندگی میں اس کی اہمیت اور معنویت کی طرف اشارہ
کر کے ایک ضروری تہذیبی اور سماجی فرض بھی انجام

دیتی ہے۔

کلیم الدین احمد پہلے تنقید کی اہمیت واضح کرتے ہیں پھر تنقید اور تخلیق کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور اس کے بعد ادبی تنقید کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہیں۔

انہوں نے ایک پتے کی بات یہ کہی ہے کہ تنقید ادبی ہوتے ہوئے بھی ادبی نہیں ہوتی۔ سماجی یا اخلاقی بھی ہوتی ہے۔ اور شعور کی تنظیم اور قدروں کے عرفان میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

کلیم الدین نے بجا طور پر ادب میں ادبیت یا الفاظ کے موزوں اور مناسب استعمال پر زور دیا ہے جس کی بدولت بقول ایک انگریزی نقاد کے لفظ کائنات بن جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ادب میں الفاظ سے غرض ہے، الفاظ سے سروکار ہے مگر یہ رشتہ توڑے بغیر الفاظ سے آگے بھی جانا ہوتا ہے۔ انہوں نے نقاد کے لئے ادب کے عرفان کے علاوہ علوم سے واقفیت کو بھی بجا طور پر ضروری قرار دیا ہے، اور جیرڈس کے الفاظ میں منتظم

اور مربوط ذہن اور ذہنی صحت کو عام کرنا، انتقاد کا سب
سے بڑا کام قرار دیا ہے۔

انہوں نے کیا اور کیسے کی بات اٹھائی ہے۔ کیا اور کیسے
شعر میں الگ الگ نہیں ہوتے۔ فن کی ایک ۔ وحدت
اکائی ہے۔ مگر تدریس کے لئے اور عام قاری کو سمجھانے
کے لئے مواد اور ہیئت کی اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں
مگر یہ صرف سہولت کے لئے، ورنہ شعر میں کیا اور کیسا
گھل مل جاتے ہیں۔ اگرچہ کیسا ہی ادبیت کی خصوصیت
اس کا جادو، اس کے حسن، اس کی اثر پذیری کا ضامن
ہے۔

انہوں نے مختلف اشعار کی مدد سے اپنی بات
واضح کی ہے۔ انہوں نے اختر شیرانی، اقبال اور ڈبلو
بی ییٹس کی مثالوں کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنا چاہا
ہے کہ اختر شیرانی کی تصویریں حسین معلوم ہوتی ہیں
مگر مبہم ہیں، اور ان کے نقش و نگار واضح نہیں۔
اقبال کے یہاں مقصد جذبات سے ایسا
گھل مل گیا ہے کہ مقصدیت نمایاں نہیں ہوتی

اور بیلے ٹس کے یہاں جو انفرادیت ہے وہ اختر شیرانی اور اقبال کے یہاں نہیں۔ زندگی کا میلان سادگی سے پیچیدگی کی طرف ہے۔ اسلئے کلیم الدین احمد بجا طور پر فن کی پیچیدگی کو اہمیت دیتے ہیں۔ نقوش میں پیٹرن (PATTERN) کو دیکھتے ہیں۔ وہ سردار جعفری کی نظم بغاوت کو ناکامیاب اور ٹوٹا ہوا ستارہ کو کامیاب قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح فیض کی نظم انتظار کے مقابلے میں ان کی نظم تنہائی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں — انہوں نے درست کہا ہے کہ شعر خاص خاص لفظوں کا مجموعہ ہوتا ہے، مگر لفظوں کا ہر مجموعہ شعر نہیں ہوتا۔ وہ شعر میں نئے اور قیمتی تجربے کو اہمیت دیتے ہیں۔

کلیم الدین حالی کی طرح یہ نہیں کہتے کہ شعر کے لئے وزن ضروری نہیں۔ مگر وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ وزن کی شعر میں زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

انہوں نے آہنگ اور لہجے کی بھی بات کی ہے اور اس طرح شعر فہمی کے لئے اور شاعری کی قدر و قیمت

کے تعین کے لیے قابل قدر معیاروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اچھا ہوتا اگر وہ ادبی تنقید کے اصولوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے نثر کی بات بھی کرتے مگر انھوں نے اس خیال سے بھی کہ شاعری کے مطالعے کے سلسلے میں جن باتوں پر توجہ ضروری ہے، وہ نثر کے مطالعے میں بھی مفید ہوں گی اور کچھ اس خیال سے کہ نثر کے مطالعے کے سلسلے میں افسانہ، ناول، انشائیہ وغیرہ سبھی نثری اصناف کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا پڑے گا، اور بات لمبی ہو جائے گی۔ صرف شاعری سے بحث کی ہے۔ اور اس کی اہمیت بہر حال ہے جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے۔

کلیم الدین احمد سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مجھے بھی ان سے بعض باتوں میں اختلاف ہے مگر ان کا مطالعہ اور احترام ضروری ہے۔ ذہنی صحت کی ضرورت پر زور دے کر بنیادی باتوں اور فروعی باتوں میں فرق کی طرف توجہ دلا کر، عالمی معیاروں کی طرف اشارہ کر کے اور اپنی بات بے لاگ لپیٹ کہنے کی وجہ سے ان کی اہمیت

مسلّم ہے۔ ادب میں نئے خیالات، پرانے خیالات کو
ہٹا کر اپنی جگہ نہیں بناتے جیسا سائنس میں ہوتا ہے۔
نئے خیالات، پرانے خیالات کے ساتھ چل کر ایک نیا
زور EMPHASIS ایک نیا تناظر PERSPECTIVE
پیدا کرتے ہیں، اور ہر ادب کی زندگی اور صحت کے لئے
یہ نئے تناظر ضروری ہوتے ہیں۔

قطعہ تاریخ

وفات پروفیسر کلیم الدین احمد

از:-

ڈاکٹر محمد ذکی الحق ریڈر شعبہ اردو بہار نیشنل کالج پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ

کلیم الدّین احمد از جہاں رفت ٭ ازیں ظلمت کدہ او ناگہاں رفت
دریغا! ناقدار دو زباں رفت ٭ یکی دانشور ہندوستاں رفت

بہ تعمیر ادب از دل فدا گشت ٭ ادیب و ناقد رمز آشنا گشت
خطاب بت شکنی برا و روا گشت ٭ دریغا آں سخن پرور جدا گشت

امید، علم و دانش را اجل برد ٭ دل ہر ماہر تنقید غم خورد
ذکی چوں سال رحلت ہاتف آورد ٭ بگفتا! ناقد راسخ قدم مرد

۱۴۰۴ھ

مرگِ کلیم پر تاثرات

"زمرگ او دل ہر کس دو نیم است
کہ در ہر دل تمنائے کلیمے است"

عابد امام زیدی پٹنہ

ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی
گورنر بہار

کلیم الدین احمد صاحب نے اردو تنقید میں نئی راہیں نکالیں اور اردو ادب کی بہترین خدمت کی۔ وہ ممتاز ماہر تعلیم تھے اور ان کی تخلیقات سے اردو ادب کو کافی فائدہ پہنچا۔ انکی وفات سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔

شری چندر شیکھر سنگھ
وزیر اعلیٰ بہار

وزیر اعلیٰ بہار نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "پروفیسر کلیم الدین احمد ایک ممتاز اسکالر، ایک مشفق استاد اور اس سے بڑھ کر ایک شریف النفس انسان تھے" ان کی موت کو وزیر اعلیٰ نے اپنا ذاتی نقصان بتاتے ہوئے

انکشاف کیا کہ کلیم الدین احمد صاحب ان کے استاد تھے

مسٹر جی جی ستھپا
وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی

پروفیسر کلیم الدین احمد کی موت سے نہ صرف بہار بلکہ پورے ملک کی ادبی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔

پروفیسر اس کے مشرا
صدر تحریری ایسوسی ایشن بہار

علمی دنیا ایک عظیم اسکالر، استاد، مفکر اور فلسفی سے محروم ہو گئی۔

ڈاکٹر عبدالمغنی
صدر انجمن ترقی اردو بہار

پروفیسر کلیم الدین احمد جدید اردو تنقید کے ایک ستون تھے۔ انہوں نے تنقید میں تنقیدی تجزیاتی طریقے کو فروغ دیا اور ادب کو آفاقی سطح دینے کی سعی کی۔

پروفیسر عطا کاکوی

پٹنہ یونیورسٹی کے تعزیتی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر عطا کاکوی نے کہا، زندگی اور موت تو قدرتی حقیقتیں ہیں مگر بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو مر کر بھی امر رہتی ہیں۔ ادیب اور دانشور بھی اسی صف میں آتے ہیں۔ کلیم الدین گو ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن دنیائے اردو زبان و

ادب کو جو سرمایہ انہوں نے دیا ہے اس سے انہیں بقائے دوام حاصل ہے۔ پانچ دہائیوں سے زیادہ تک ان کے ساتھ میری وابستگی رہی ہے۔ بے شمار یادیں ہیں جنکے اظہار سے اسوقت زبان قاصر ہے۔

پروفیسر سید حسن پٹنہ | پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب سے میرے ذاتی اور گہرے تعلقات تھے میں ان کا شاگرد رہ چکا ہوں۔ معاصر نے مجھے اور بھی انسے قریب کر دیا تھا۔ ان کی وفات نے ذہن کو بالکل ماؤف کر دیا ہے۔ اور زبان گونگی ہو گئی۔

پروفیسر محسن پٹنہ | میں نے کلیم الدین احمد صاحب کو ایک با اصول اور ہمدرد انسان پایا۔ وہ جو کہتے تھے وہی کرتے بھی تھے۔

ماہنامہ کتاب نما دہلی | پروفیسر کلیم الدین احمد کا انتقال اردو دنیا کیلئے بہت بڑا سانحہ ہے علمی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی مسائل سے ان کی دلچسپی محض پیشہ ورانہ نہیں تھی۔ عام زندگی میں وہ ایک خاموش، گوشہ گیر، احتیاط پسند اور شرمیلے انسان تھے لیکن جب بھی انہوں نے

کسی موضوع پر قلم اٹھایا تو اس۔ ت بے باکی کے ساتھ اور اپنا بات ہمیشہ ایسے ڈو ٹوک بے ریا لہجہ میں کہی کہ سننے اور پڑھنے والے حیران بھی ہوئے اور کسی حد تک پریشان بھی۔

اردو تنقید میں ان کی آواز بلند بھی تھی اور منفرد بھی۔ انہوں نے اردو تنقید کو ایک نیا لہجہ ہی نہیں دیا، ایک نئے مزاج ایک نئی اخلاقیات کا راستہ بھی دکھایا۔ مشرق و مغرب کے علمی وادبی سرمایے پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ کلیم صاحب جیسے باخبر عالم اور نقاد ہمارے ادبی معاشرے میں گنتی کے ہیں اردو شعر وادب کے ایوان میں ان کی آواز مدتوں گونجتی رہے گی اور آئندہ بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی۔

مرحوم کلیم الدین احمد کو خراج عقیدت و محبت پیش کرنا ہمارا فرض ہے۔	علی سردار جعفری

کلیم صاحب کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی عالمانہ حیثیت اور دانشوری سے انکار کرنا کفر سے کم نہیں۔ انہوں نے جو بھی علمی اور تنقیدی کام کیا وہ لگن سے کیا اور عوام کے اور نتائج سے بے نیاز ہو کر کیا۔ کیوں کہ ان کو اپنی دانش پر اعتماد تھا اور کسی کو خوش

کرنے کے لئے قلم نہیں اٹھاتے تھے، اپنی بات کہنے کیلئے قلم اٹھاتے تھے۔ مرحوم کا سرمایہ نقد و ادب اختلافی آوازوں کے باوجود ہمارا سرمایہ ہے۔

گوپال متل

۲۱ اور ۲۲ دسمبر (۸۳ء) کی درمیانی شب کو اردو کے اہم ترین نقاد جناب کلیم الدین احمد کا انتقال ہو گیا۔ کلیم الدین احمد انگریزی کے پروفیسر تھے اسلئے مغربی ادب کے بارے میں ان کی معلومات تفصیلی تھیں مغربی اصول تنقید سے واقفیت کا دعوٰی تو اردو کے تقریباً سبھی ناقدین کرتے ہیں۔

حالی نے بھی جن کی معلومات شنیدہ کی حد تک تھی لیکن کلیم الدین احمد کی تنقیدی تحریروں کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ انہوں نے مغربی تنقیدی اصولوں کو برتا بھی ہے۔ کلیم الدین احمد کا یہ قول کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے" غزل کا شہ بلندانہ ستائش کا شدید رد عمل ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مہذب پیرایہ اظہار نثر ہے۔ اس کے مقابلے میں شاعری خواہ نظم ہو یا غزل نسبتاً نیم وحشی ہی ہو گی۔ شاعری بہرحال اضطراری کیفیات کا اظہار ہے اسمیں ذہن کا اتنا شدید پہرہ نہیں ہوتا جتنا نثر پر

شہباز حسین | کلیم الدین احمد کے انتقال سے ایک ایسی شخصیت اٹھ گئی جو گذشتہ ۴۰، ۴۵ سال سے اردو ادب میں بڑی متنازعہ فیہ رہی ہے۔

ان کے نظریات اور حالات پر بڑی بحثیں ہوئیں اور جتنا ان کے خلاف لکھا گیا بہت کم لوگوں کے خلاف لکھا گیا ہوگا۔ انہوں نے ادیبوں اور شاعروں کا ایسا تجزیہ کیا کہ مروجہ خیالات اور مسلسل عقاید بری طرح مجروح ہوئے مگر اس کے باوجود ان کی تحریروں کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ایک نئی بصیرت ایک نیا ادراک پیدا کیا، اور اردو میں عملی تنقید کی شروعات کی۔

کلیم صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ انہوں نے بہتوں کا بھلا کیا ہے۔ بہار میں اردو کے فروغ کے لئے زبردست خدمت انجام دی ہے۔ ادبی دنیا میں ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا۔

جامعہ دہلی | ۲۲ دسمبر ۸۳ء (صحیح تاریخ ۲۱ دسمبر) کو اردو کے مشہور اور قدرے سخت نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کا انتقال ہو گیا۔ بلاشبہ یہ ایک بڑا سانحہ ہے ان کی تحریریں لوگ غور سے پڑھتے تھے۔ ان تحریروں کے بعض

پہلوؤں سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو ان کی قابلیت اور علمیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع اور نظر گہری تھی۔ عالمی ادبیات کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ تنہائی کے دلدادہ تھے، ان کی دوستی کتابوں سے تھی، زبان خاموش ہوتی ہے تو قلب گویا ہوتا ہے۔ بت شکنی ان کی طبیعت کا جزو تھی۔ اپنی رائے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے ان کو شکایت تھی کہ نئے لکھنے والے محنت نہیں کرتے سچ کہتے گھبراتے ہیں۔ بعض لوگوں کو نئے تجربے کرنے کا شوق ہے لیکن اپنے اس شوق کو یا تو نقالی سے رسوا کرتے ہیں یا عجز علمی کم مائگی سے۔ کلیم الدین کو لوگ ان کی خوبیوں اور ان کے ادبی تفردات کی وجہ سے یاد رکھیں گے۔
ہم ان کی مغفرت کیلئے دعا کرتے ہیں۔

معارف، فروری ۱۹۸۴ء | گذشتہ سال کے آخر میں اردو دنیا کو جس حادثہ فاجعہ سے دوچار ہونا پڑا وہ مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کا انتقال پر ملال ہے۔ ان کی شخصیت ایک جلوۂ صد رنگ تھی۔ وہ پروفیسر بھی رہے اور ایڈمنسٹریٹر بھی، ناقد بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی، محقق بھی تھے اور شاعر بھی اور ان سب سے بلند ایک شریف انسان بھی۔ ان کی شخصیت میں جہاں گوناگوں صلاحیتیں جمع ہوگئی تھیں وہاں وہ بڑی متنازعہ فیہ بھی رہی۔ اردو شعر و

ادب کے ایوان میں ان کی آواز سب سے جداگانہ اور منفرد تھی ان کی تحریریں کچھ ایسی انتہا پسندانہ اور سخت تھیں ایک بڑا طبقہ ان سے ناراض ہو گیا۔ ان کے قلم سے اردو سرمایہ میں اضافہ ہوا اور تاریخ ادب اردو میں اپنا ایک خاص مقام بنا گئے جس کی وجہ سے وہ کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

ان کی بڑی خوبی تھی ان تھک محنت اور مسلسل گھنٹوں کام کرنا۔ وہ بلا شبہ کثیر المطالعہ اور بڑے باصلاحیت انسان تھے لیکن غلو، انتہا پسندی اور عدم توازن نے ان کی کتابوں کے وزن کو کم کر دیا ہے۔ اگر ان کی تنقیدوں میں توازن اور اعتدال ہوتا تو یقیناً بڑے اعلیٰ درجے کے نقاد ہوتے اور نہایت ہی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا | **چنگاری ۔ دہلی**

اردو تنقید کا سب سے روشن چراغ بجھ گیا۔ کلیم الدین احمد اردو کے واحد نقاد ہیں جنہوں نے باضابطہ کتابیں لکھی ہیں۔ مبسوط اور مربوط۔ ورنہ زیادہ تر نقاد وہ ہیں جنہوں نے مختلف اوقات میں مختلف ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت مضامین لکھے اور انہیں مجموعہ کی شکل میں شائع کرا دیا۔ اسی لئے ان میں تکرار بکثرت ملتا ہے اور تضاد بھی۔

کلیم الدین احمد نے زندگی بھر اعلیٰ عالمی اور ابدی معیاروں کو
پیش نظر رکھ کر ادب کی پرکھ کے جو اصول پیش کئے وہ واضح روشن
اور نمایاں ہیں۔
انہوں نے ذاتی پسند اور ناپسند کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ صداقت
ان کا شعار تھا اور محنت اور لگن شیوہ۔ ہم نے ان کی قدر نہیں کی یہاں تک
کہ ساہتیہ اکادمی نے انہیں ایوارڈ تک نہیں دیا۔
کلیم الدین کی تحریروں کو اکثر لوگوں نے "شوک ٹریٹمنٹ"
(برقی علاج) قرار دیا ہے۔ ان سے اکثر لوگ ناراض تھے حالاں کہ
انہوں نے کوئی غلاظت نہیں پھیلائی بلکہ جہاں غلاظت تھی وہاں
لالیٹن روشن کر دی۔
اردو اس دور کے سب سے بڑے ناقد سب سے بڑے
خادم ادب سے محروم ہو گئی۔

سب رس ایوان اردو کراچی | برصغیر پاک و ہند کے عظیم نقاد،
محقق، شاعر اور ماہر تعلیم پروفیسر کلیم الدین احمد کا پٹنے میں انتقال ہو گیا
ان کی عمر ۷۶ سال کی تھی، انہوں نے مغربی ادب اور تنقید سے استفادہ
کر کے اردو تنقید کو بلند مقام تک پہنچا دیا۔ وہ ایک درجن سے زیادہ
کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب عملی تنقید کو خاص اہمیت حاصل ہے

ان کے ادبی اور تنقیدی کارنامے اتنے زیادہ ہیں کہ اہل اردو انہیں فراموش نہیں کرسکتے۔

ادراک مظفرپور عہد حاضر کی دانشوری کی ایک روشن ترین اکمر معدوم ہوگئی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم ہو گئے۔ ایک بے باک ناقد، وسیع المطالعہ ناقد، مصلحت سے بے نیاز ناقد، نظریاتی وفاداریوں سے لاتعلق ناقد، تنقید جدید کی روایات کے سرکردہ ناقد، سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اور موضوع بحث بننے والے ناقد ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ضعیف العمری کے باوجود علم و ادب سے شغف کا عالم کم دیکھا گیا ہوگا۔ ہماری ادبی مجلس ایک جلیل القدر شخصیت سے محروم ہوکر مہیب سناٹے میں مبتلا ہے۔ کیا اس نقصان کی تلافی ہوسکے گی۔

بہار اردو اکادمی دلعزیتی جلسہ کی تجویز۔ اردو زبان و ادب کی ایک تابندہ اور روشن شمع بجھ گئی۔ ان کی موت سے برصغیر کی اردو ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسکا پر ہونا مشکل ہے۔ انکی نیک نفسی شرافت اور انسان دوستی رہتی دنیا تک مثال بنی رہے گی۔" روزنامہ "ساتھی" پٹنہ پروفیسر کلیم احمد گرچہ ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ہم ان کے اپنائے ہوئے اصول کے آگے سر جھکاتے ہیں، طبل و علم تو ہم انہیں نہ دے سکے لیکن ہم ان کی شایان شان یادگار قائم کریں یہ ہماری حق شناسی ہوگی۔ اور ہماری ہمت اور حوصلے کا امتحان بھی۔

۱۸۱

سفینۂ ادب کا ترجمان

دو ماہی

سفینہ

شمارہ ۱۱

مئی، جون ۱۹۸۴ء

مؤلفہ:۔ سید احمد دہلوی مع تعلیقات ۲۳ تا ۳۲

(مدیر)

عطا کاکوی

قیمت تین روپے — Rs. 3/00

ملنے کا پتہ:۔ / چھپنے کا پتہ:۔ کمال بک ہاؤس سبزی باغ پٹنہ ۴

ملاحظات

گذشتہ شمارہ کلیم الدین احمد نمبر کے طور پر شایع ہوا۔ پروفیسر کلیم الدین ادیب بھی تھے اور نقاد بھی۔ شاعر بھی تھے اور صحافی بھی۔ لغت نویس بھی تھے اور فرہنگ ساز بھی، معلم بھی تھے اور تحقیقی مقالات کے نگراں اور ممتحن بھی، مختلف اداروں کے سربراہ بھی تھے اور مدیر بھی۔ ان کی بے وقت اور اچانک موت نے اردو زبان و ادب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی آسان نہیں۔

سفینہ کا یہ خاص شمارہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ دعوی غلط نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ کلیم الدین احمد کی جملہ خصوصیات پر اس شمارے کے مطالعے سے روشنی پڑے گی۔ اور قارئین کو ان کی ساری تخلیقات کا ایک مکمل خاکہ نظر آجائے گا۔

میں نے پچھلے کسی شمارے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید ملاء اعلیٰ میں کوئی مشاعرہ منعقد ہونے والا ہے۔ جو بے در بے وہاں شعرا شرکت کے لئے مدعو کئے جا رہے ہیں ـــــ جوش گئے، فراق گئے، ابیدل گئے، واتش گئے، عندلیب گئے، بمبر ساغر بھی روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ شاید راستے

ہی میں ہوں گے کہ تارش پرتاپ گڈھی کا بلاوا آگیا۔ یعنی وہ بھی ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس دور کے خوشگو شاعروں میں ان کا نام و شمار ہوتا تھا۔ اکثر شاعروں میں ان کو سننے کا اتفاق ہوا۔ نجو کر لکھتے تھے۔ اور سنبھل کر پڑھتے تھے۔ فن سے آشنا تھے اور صحت زبان کا لحاظ رکھتے تھے۔ طویل نظمیں بھی دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی تھیں۔ اب ایسے صفات کے حامل شعراء بھی مشکل ہی سے ملیں گے۔

ادھر پٹنہ میں دو علمی و ادبی مذاکرے (سمینار) منعقد ہوئے۔ ایک سمنار تو خدا بخش پبلک لائبریری میں بڑے اونچے پیمانہ پر برصغیر کے حکماء الاطباء اور طبی مخطوطات عربی و فارسی کے ماہرین کا منعقد ہوا۔ اس کا پہلا افتتاحی جلسہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت جناب حکیم عبدالحمید صاحب (دہلی) نے فرمائی۔ اور افتتاح جناب گورنر بہار اخلاق الرحمن صاحب نے فرمایا۔ پھر دو دنوں تک بڑی سرگرمی اور دلچسپی کے ساتھ مذاکرے ہوئے جن میں اہل علم و دانش نے بڑی بصیرت افروز طبی معلومات بہم پہنچائیں اور سیکڑوں عربی و فارسی طبی مخطوطات جو برصغیر کے تمام کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔ ان پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی۔ الغرض یہ سہ روزہ سمنار تھا جو حسن و خوبی پٹنہ کی سرزمین پر منعقد ہوا اور اس کی یاد تا دیر قائم رہے گی۔

دوسرا سمنار ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی یاد میں منعقد کیا گیا۔ اس کا دو روزہ اجلاس ۱۸،۹ اپریل کو اردو اکادمی بہار کی جانب سے منعقد کیا گیا۔ صدارت اور افتتاح کی رسم صوبہ کے وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم نے ادا کی۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد بہار کے ایک ممتاز معلم اور صدر شعبہ عربی و فارسی اور اردو، پٹنہ یونیورسٹی تھے۔ شاعر تو تھے ہی ان کا مجموعہ کلام "گل نغمہ" چھپ چکا ہے۔ ان کا محبوب مشغلہ قرآن کی تفسیر تھا۔ اور اس حیثیت سے ان کی شہرت تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی تحقیقات ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں۔ بہار کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے اپنے اپنے مقالے پڑھے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی علمی، ادبی اور تعلیمی اثرات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی۔ اور ان پر بحثیں ہوئیں۔ ایک مقالہ میں یہ بات ثابت کی گئی کہ اردو میں "سانیٹ" لکھنے والوں میں ڈاکٹر عظیم الدین پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس صنف کو اردو شاعری میں روشناس کیا۔

اس سمنار کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے مایہ ناز فرزند پروفیسر کلیم الدین احمد تقریباً دو ماہ قبل اچانک اپنے مرحوم والد سے ہمیشہ کیلئے جا ملے۔ وہ ہوتے تو یہ سمنار اور زیادہ دلکش اور باوزن ہو جاتا۔

کلیم الدین احمد کی وفات سے جو بہار اردو اکادمی کے نائب صدر کی جگہ خالی ہو گئی تھی وہ جناب شہاب دسنوی صاحب کی تقرری سے پر ہو گئی۔

جناب شہاب صاحب ہمارے صوبہ کے ایک لائق فرزند، مشہور ادیب اور مدیر اور بہت ساری خوبیوں کے مالک ہیں وہ ایک عرصہ تک بمبئی میں اپنے فرائض منصبی بحسن و خوبی ادا کرتے رہے۔ پھر دہلی میں علمی مشاغل میں منہمک رہے۔

امید ہے کہ ان کی ذاتی صلاحیت اردو اکادمی کے وقار اور افادیت کو نہ صرف برقرار رکھے گی بلکہ اسکے مستقبل کو تابناک بنائیگی۔

صحت زبان فریضۂ ادب میں داخل ہے۔ ہر زبان کے قواعد ہیں اصول ہیں، پابندیاں ہیں۔ ان سے انحراف ادبی و علمی گناہ ہے۔ اور ادیب اور شعراء اگر ان پابندیوں کا خیال نہ کریں تو زبان "چوں چوں کا مربا" ہو کر رہ جائے گی۔ یہی حال تلفظ کا بھی ہے۔ اردو املا کی طرح تلفظ کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ انشاء اللہ آئندہ شمارے میں تلفظ کے مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ عموماً ہم لوگ گھر پر بالخصوص نشستوں میں تلفظ کی غلطیاں تو کرتے ہی ہیں اخبارات سے بھی غلط تلفظ کا اشتہار جشن سامان ہوتا ہے

یہاں وہاں سے

(۲)

(۱۳) اورینٹل کالج میگزین شمارہ مسلسل ۲۲۴ میں ایک مضمون "نوادر شبلی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ شبلی کی یہ تحریر ان کے کسی مجموعۂ مقالات میں شامل نہیں۔ اس تحریر کا عنوان ہے "مکتوب بنام امیر مینائی" حالانکہ یہ مکتوب بنام مینائی نہیں بلکہ ان کے ایک شاگرد ثاقب نے جو اپنے استاد کے مکاتیب شائع کئے تھے اس پر شبلی کی ایک تقریظ ہے جو ثاقب نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شائع کر دیا۔ بہرکیف یہ ایک ضمنی بحث ہوئی۔ اس تقریظ میں شبلی نے شعری تخلیق سے متعلق ایک چونکا دینے والی بات لکھی ہے جو درج ذیل ہے:

"اہل عرب کا خیال ہے کہ شاعر جس قدر علم رسمی سے بے بہرہ ہو گا اسی قدر بڑا شاعر ہو گا۔ یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔ فارس میں دیکھئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی، انوری اور نظامی کے مقابلے جاہل تھا تاہم انوری کو اسکی مجبوراً

کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں ؎

" کہ آراست زلف سخن چون عروس

جامی علم و فن میں نظامی سے بڑھ کر ہیں۔ غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں ہے" [شبلی ۱۰ / جنوری ۱۹۱۲ء]

(۱۸۱) " اقبال معاصرین کی نظر میں" ایک کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے اس کے مرتب جناب وقار عظیم ہیں اسمیں مختلف اشخاص کے مضامین ہیں جن میں ایک مضمون " اقبال کی اردو" کے عنوان سے محمد محمود زماں خاں کا بھی ہے " اقبال کی اردو" پر مرقع لکھنؤ میں ایک مضمون " حکیم صاحب" کا شایع ہوا تھا اور اس میں اقبال کی غلطیاں دکھائی گئی تھیں، اس کا جواب زماں خاں صاحب نے دیا ہے۔ حکیم صاحب کا ایک اعتراض اقبال کے اس مصرع پر بھی تھا کہ " اپنے انکار ساتھ لاتے ہیں"۔

لفظ انکار پر اعتراض تھا۔ انکار سے ہونا چاہئے۔ اس پر زماں خاں صاحب نے لکھا کہ باوجود تلاش یہ مصرع اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں نہ ملا۔ مگر اسپر ایک نوٹ غالباً وقار عظیم صاحب کا ہے کہ " اقبال نامہ جلد دوم میں عطیہ بیگم کے نام ایک خط میں اقبال کے چند اشعار نقل کئے گئے ہیں اور ان میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں کچھ اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

گویا یہ شعر اقبال کے کسی مجموعہ میں نہیں بلکہ ضمناً خط میں لکھا گیا ہوگا۔ حالاں کہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ بانگ درا میں نظم سیر فلک میں موجود ہے۔

زماں صاحب اقبال کی بے جا طرف داری اور حمایت کے جوش میں یہ فرماتے ہیں کہ انگار نہیں بلکہ افکار ہوگا۔ حالاں کہ مضمون کے اعتبار سے دوزخ کی خنکی مٹانے کیلئے انگار یعنی انگارے ہی درست ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اقبال سے غلطی ہوئی۔

(۱۵) محمد حسین خاں الم کو سخن شعرا میں مصحفی کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ لیکن افسر صدیقی نے اطلاع دی ہے کہ یادگار ضیغم میں ان کو آتش کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ ان کا نام کہیں کہیں محمد حسین خاں یا محمد حسینا خاں بھی ملتا ہے — یہ حکمت علی خاں کے بیٹے اور عظیم آباد کے باشندے تھے۔ مگر غازی پور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ الم کے دو شاگرد حسین دوست خاں رسا اور مولوی محمد عمر شگفتہ تھے۔ (افسر صدیقی)

الم کا دیوان خود ان کے ہاتھ کا مخطوطہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز دہلی میں موجود ہے۔ ۲ ذی الحجہ ۱۲۴۹ھ/۲۲ اپریل ۱۸۳۴ء کا مرقومہ ہے جو عظیم آباد میں بخط مصنف تحریر ہوا ([illegible])

(۱۶) شیر شاہ کے روضہ میں ایک مسجد پر کتبہ ہے اس میں سلیم شاہ کی مدح میں ایک شعر ہے سو

خدایا بقائے عمر تو بادا ہزار سال
سالے ہزار ماہ و ماہے ہزار سال

(منقول از شیر شاہ مصنفہ ڈاکٹر حسن آرزو)

اسی قسم کا دعائیہ فقرہ غالب نے بھی بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ایک قطعہ کے آخر میں لکھا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بظاہر مقدم الذکر شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۷) غالب کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو شعرا جو دامن غالب سے وابستہ تھے ان کا ذکر تلامذۂ غالب مرتبہ جناب مالک رام میں ملتا ہے ان شعراء کے علاوہ بھی کچھ ایسے ہیں جو وقتاً فوقتاً شاگرد غالب کی حیثیت سے برآمد ہوتے رہے ہیں۔ انہی میں ایک گجراتی شاعر سید محمد حسن صالح فدا بھی ہیں۔ ان کا کلام دیوان فدا کے نام سے سید وحید اشرف اور مالک رام کا مرتب کردہ بڑودہ (گجرات) سے شائع ہوا ہے۔ معارف نومبر ۱۹۸۳ میں اس پر ریویو کے سلسلے میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ فدا غالب کے شاگرد تھے۔

(۱۸) شاد عظیم آبادی عربی، فارسی اور اردو کے مسلم الثبوت عالم تھے۔ اردو میں اپنی غزل گوئی کے باعث وہ مشہور ہوئے ہیں اردو غزلوں میں ان کے عربی کلمات اور مصرعوں کا استعمال ان کی عربی دانی پر دال ہے۔ فارسی تو خیر ان کے قصیدے اور قطعات کے علاوہ مثنوی میں بھی موجود ہے۔ عرصہ سے یہ تلاش تھی کہ آیا انہوں نے فارسی غزلیں بھی کہی ہیں یا نہیں۔ میری زیر نگرانی ایک طالب علم نے ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ سے شاد کی فارسی شاعری پر مقالہ لکھ کر ڈکتور ال ادب کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس سلسلہ میں شاد کی فارسی غزلیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ناسخ نے فارسی شعراء کا بھی ایک تذکرہ لکھا تھا اس میں شاد کی فارسی غزلیں شامل کی ہیں۔ یہ بھی پتا چلا تھا کہ یہ تذکرہ ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ مگر مزید تلاش سے معلوم ہوا کہ وہاں مفقود ہے۔

معارف بابت مارچ ۱۹۸۲ء میں ایک مضمون آصفہ احمد صاحبہ (علی گڑھ) کا نظر سے گزرا جوان کے خاندان کے ایک بزرگ کی مرتب کردہ بیاض ہے۔ اس میں دو شعر فارسی کے بنام شاد عظیم آبادی نظر سے گزرے۔ بیاض عموماً اپنے ذوق کی تسکین کیلئے مرتب کی جاتی ہے۔ بیاض

نویس کو اشعار سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ اسلئے خالق سے نہیں
اسکے قدیم بیاضوں میں آپ اشعار کا غلط انتساب پائیں گے۔
اب یہ دو اشعار جو شاد کے نام سے منسوب ہیں معلوم نہیں بیاض
نویس نے تحقیق کرکے ان کے نام سے منسوب کیا ہے یا مضمون
نگار نے ایک شعر میں لفظ "شاد" پاکر اسکو شاد سے منسوب کیا ہے
اس میں شاد بطور تخلص آیا ہے یا اپنے عمومی معنوں میں۔ بہرکیف اس کو
شاد کا ہی شعر سمجھا جائے گا۔ تا آنکہ کوئی دوسرا اس کا دعویدار ہو
ہاں تو وہ اشعار یہ ہیں :-

بدیں عیار اے دل چند روزی باختی رفتی
متاع دین و دنیا در محبت باختی رفتی

نہ فہمیدی کہ ایں شاد است و نا شاد است در ہجراں
شکارے بود از فتراک خود انداختی رفتی

(۱۹) اسی بیاض میں شاد کی ایک اردو غزل بھی درج ہے

ترے جور کا نہ کروں گلہ کہ ٹے تیغ سے بھی اگر گلا

اس غزل کے یہ کل اشعار ہیں مگر اکثر جگہ متداول مطبوعہ غزل
سے مختلف ہیں لفظوں میں تغیر و تبدل کیا گیا ہے بعض اشعار نئے بھی
ہیں۔ جناب شاد اپنے کلام پر بار بار حک و اصلاح فرماتے رہتے تھے۔

ممکن ہے یہ غزل جو بیاض میں نقل کی گئی ہے اسکی ابتدائی شکل ہو بہرحال "شادیات" کے سلسلہ میں یہ قابل توجہ ہے جن کو یہ غزل دیکھنی ہو وہ معارف بابت مارچ ۱۹۴۲ء کی طرف رجوع کریں۔

(۲۰) ایک مخطوطہ بنام مجلس آرا کا پتا ڈاکٹر سید شاہ طیب ابدالی سے ملا جو انہوں نے الہ آباد میں دیکھا تھا۔ اسکے متعلق ان کی ایک تحریر حسب ذیل ہے۔

"جناب محمد نظام الدین صاحب محلہ بہادر گنج الہ آباد کی ملک میں ایک قلمی نسخہ ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نسخہ میں فارسی کی غزلیں، حکایات، ابیات اور نثر میں نکات ہیں۔ آخر میں یہ تحریر ہے۔

"تحت مجلس آرا میرزا عبدالقادر بیدل غفر ذنوبہ بتاریخ بست و چہارم شہر شعبان ۱۱۴۵ھ جلوس والا عہد بدولت عہد محمد شاہ بادشاہ غازی"

مجلس آرا نام کا کوئی رسالہ بیدل کے نام سے اور کہیں دستیاب نہیں۔ اس رسالے کی کتابت بیدل کے انتقال کے بارہ سال بعد کی ہے۔

قیاس تو یہی چاہتا ہے کہ شاید یہ "نکات بیدل" ہی کا نسخہ ہے جو مجلس آرا کے نام سے موسوم ہوا۔ پھر بھی اگر کسی صاحب علم پر عد کو اس کا موقع ہو تو اصل نسخہ کی طرف رجوع کریں اور اس پر مزید روشنی ڈالیں۔

(۲۱) نکر و نظر علی گڈھ کے شمارہ جنوری ۱۹۳۲ء میں ایک مضمون ادب

اور نفسیات کے عنوان سے ظفر احمد صدیقی صاحب کا شائع ہوا ہے اسکے صفحہ پر ایک شعر انہوں نے شاد عظیم آبادی کے نام سے منسوب کیا ہے

وہ شعر یہ ہے :-

نہ دے شراب دم صبح کلالی موڑ موڑ کے
بھلا ہو تیرا کسا قیا پلا دے خم نچوڑ کے

یہ شعر شاد کی میری نظر میں کہیں نہیں گزرا۔ معلوم نہیں مضمون نگار کا کیا ماخذ ہے میرے خیال میں یہ غلط انتساب ہے۔ لفظی اور معنوی دونوں حیثیت سے شاد کے رنگ و آہنگ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ ابتدائی دور کا ہو اور مسترد الکلام کر دیا گیا ہو۔

(۲۲) نظیر اکبر آبادی کے حالات زندگی پر ابھی بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بہت سے مسئلے متنازع فیہ بھی ہیں۔ "آج کل" بابت فروری ۱۹۸۴ء میں ایک بڑا مختصر مضمون نگاہی احمد خالدی کا شائع ہوا ہے۔ اسمیں انہوں نے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے کہ نظیر آخر پیدا کہاں ہوئے تھے۔ انہوں نے مختلف ذرائع سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ نظیر دہلی میں نہیں بلکہ آگرے اپنی ننہال میں پیدا ہوئے تھے اس نئی تحقیق کا امکان بڑی حد تک قابل قبول ہے۔ شہبا نے اپنے اشہب تحقیق کی جولانی دکھلائی ہے۔ اور مفرد لسانی انداز میں ان کی

پُشیز دیگر رسوم سے کتاب زندگانی نظم کو حقیقتاً کہانی بے نظیر بنا دیا ہے۔ اس کی دوسری اشاعت ترقی اردو بورڈ سے ہوئی اور اسکے مرتب ڈاکٹر حسینی ہیں۔ مرتب کے جو فرائض تھے ان سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے۔

(۲۲۳) میر کی میری مسلم ہے مگر ان کے فنی محاسن، اور شعری لطافت کی بصیرت افروز تشریح د توضیح اب تک نہ ہو سکی تھی۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اس بھاری پتھر کو اٹھانے کا بیڑا لیا، اور اس کو صرف چوم کر نہیں چھوڑا بلکہ مختلف پہلوؤں پر دیدہ وری اور نکتہ شناسی کا ثبوت بھی دیا۔ "شعر شور انگیز" کے عنوان سے ابتک ان کے قلم سے کئی قسطیں مختلف رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ قائم رہا تو اسکے ہزار صفحات سے زیادہ ضخامت کا اندازہ ہے۔ فاروقی صاحب نے میر کا بھرپور مطالعہ کیا ہے۔ اور بڑی وسعت نظر کا ثبوت دیا ہے۔ خود میر کے متحد المضمون اشعار۔ نیز دیگر شعراء کے بھی اسی مضمون کے اشعار سے موازنہ و مقابلہ ایک خاصہ کی چیز ہے۔

رسالہ افکار (جون ۸۳ء) میں میر کے جو ایک شعر کی تشریح کی ہے، وہ شعر یہ ہے

اس گل زمیں سے اب تک اگتے ہیں سرو مائل
مستی میں جھکنے جس پر تیرا پڑا ہے سایہ

اور اس سلسلے میں ناسخ کا ایک شعر یہ پیش کیا ہے ؎

باغ سے لگتے ہیں واں گل رعنا اب تک
جس جگہ سایہ پڑا تھا تری رعنائی کا

میر اور ناسخ سے تو خیر مقابلہ ہی کیا؟ مگر بیچارہ ناسخ اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ در خور اعتنا نہ سمجھا جائے۔ دس بیس اشعار تو اس نے یقیناً اچھے کہے ہیں۔ بہرکیف فاروقی صاحب معترض ہیں کہ ناسخ کے شعر کے پہلے مصرع میں "سے" کی تکرار ناگوار ہے۔ غالباً فاروقی صاحب نے ناسخ کے دیوان کے دیگر نسخوں کو ملاحظہ نہیں کیا۔ اصل شعر یوں ہے۔

" باغ میں لگتے ہیں الخ" سے کی جگہ میں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ رعنائی کا سایہ اسقدر تجریدی ہے کہ ہلکا اور بے لطف ہو گیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ رعنائی مجسم ہو کر جلوہ ریز ہوئی ہے اور اس نے شعر میں حسن پیدا کر دیا ہے بہرحال یہ اپنی اپنی پسند کا معاملہ ہے۔

اسی طرح غالباً زبان و ادب کے کسی شمارے میں میر کا ایک شعر نقل ہوا ہے ؎

نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا
شاعری تو شعار ہے اپنا

اسکی تشریح یوں کی گئی ہے کہ چونکہ نکتہ میر اشتاق اور یار ہے اسلئے

میں نے شاعری کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ گویا نکتہ عاشق ہے اور میر معشوق ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ پہلے مصرع میں "دا" سہو کاتب ہے۔ اسکی قرأت یوں ہے ؎ نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا
یعنی میرا معشوق نکتہ کا مشتاق ہے۔ یہ ترکیب میر کے یہاں اور بھی آئی ہے ؎ سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
ہاں تو شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ چونکہ میرا معشوق بڑا نکتہ شناس ہے، نکتہ مشتاق ہے اسلئے ہم بھی شاعری میں نکتے کی باتیں بیان کرتے ہیں
غالب کا معشوق نکتہ چیں تھا۔ میر کا نکتہ مشتاق ہے

(۴۲) معارف دسمبر ۱۹۶۸ء میں لندن کی ڈائری سے ایک اقتباس:۔
جس روز ہم لوگ لندن پہنچے اسی روز اخبار میں دیکھا کہ یہاں تین لاکھ بچے بن باپ کے پیدا ہوئے۔ بولٹ فنڈ سے بچے تو اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں ورنہ احتیاط کے اتنے طریقے ہیں کہ اسکی شرح خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ طریقے نہ ہوں تو معلوم نہیں ناجائز بچوں کی تعداد کتنی بڑھ جائے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ جائز و ناجائز بچوں کی تفریق ختم کرنے کی خاطر یہاں کی پارلیمنٹ میں شاید یہ بل بھی آجائے کہ شادی بیاہ کے رسمی بندھن کو ختم ہی کر دیا جائے۔ اور یہ بل تو یہاں کی پارلیمنٹ میں پہلے منظور ہو چکا ہے کہ مرد مرد سے عورت عورت سے شادی کر سکتی ہے۔

(۲۵) غلام السیدین کے ایک مضمون سے اقتباس :۔

مرزا مسعود کی روایت ہے کہ جسٹس محمود نے اپنے والد سر سید احمد سے دوران گفتگو یہ کہا کہ " ابا جان! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس کی پرستش کے لئے تو تیار ہے تو میرے پاس جواب حاضر ہے، کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے "

(۲۶) محمد حسین آزاد کے نام منشی ذکاء اللہ کے ایک خط کا اقتباس (غالب سے متعلق) آب حیات کی تالیف کے موقع پر آزاد نے ذکاء اللہ سے غالب کے متعلق کچھ استفسار کئے تھے ذکاء اللہ نے جو جواب دیا وہ یہ ہے :۔

" مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اسقدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ تنگ دل ایسا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں افسوس نہ تھا۔

جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ میاں شعر کہنا کیا جانے، نہ کسی نے شراب پی نہ قمار بازی کی نہ معشوقوں

کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں۔ نہ چل سکا نے میں پڑا۔ طارع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس جگہ بکتا تھا۔

ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ شیفتہ اور ایک شیرازی کا سفر میں ساتھ ہوا۔ انہوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کیلئے دیا اس نے دیکھ کر واپس کر دیا کہ "دریں خرافات اوقات ضایع نہ کنیم۔ مامی دانیم کہ درکدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است"

عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو نظم و نثر اس کے یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔

(۲۷) بہار شریف سے ۱۸۸۲ء میں ایک ماہانہ گلدستہ اشعار بنام "گلدستہ بہار" شائع ہوتا تھا جس میں بہار کے شعراء کے حالات اور کلام شائع ہوتے تھے۔ اس کے مرتب جناب سید شاہ عطا حسین بہاری تھے۔ عطا بہاری وہاں کے رئیس اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔ اور بلدیہ کے رکن بھی۔ یہ گلدستہ عام طور پر غیر معروف ہے۔ اس کی قدامت اس کی خصائص ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ اسکی اشاعت کب تک ہوتی رہی۔ (قارئین سفینہ اس گلدستہ پر کچھ روشنی ڈال سکیں تو

سفینہ اِن کی اُنکی نظر میں

(۲)

(۸) عبداللطیف اعظمی ۲۳۴۹ ذاکر نگر
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۲۵ دسمبر ۱۹۸۳ء

محترمی! تسلیم
ازراہ عنایت کل آپ نے ماہنامہ سفینہ کے جو آٹھ شمارے عنایت فرمائے تھے ان کو گھر جانے کے بعد رات پڑھ ڈالا۔ آپ نے اردو زبان وادب اور شاعری کی متعلق ذرائع سے جو گراں بہا خدمت انجام دی ہے اس کا احساس واعتراف اردو کے ہر ادیب کو بجا طور پر ہے۔ آپ کی ایک خصوصیت کو خاص طور پر میں بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں وہ یہ کہ اہم واقعات اور شاعروں اور ادیبوں کی زندگی اور خدمات کی تاریخوں پر جو آپ کی وسیع نظر ہے وہ خاص طور پر قابل قدر ہے چونکہ مجھے تاریخوں سے خصوصی دلچسپی اور لگاؤ ہے اسلئے آپ کی کتابیں اور تحقیقی مضامین پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اور بوقت ضرورت استفادہ کرتا ہوں۔ اسی نقطۂ نظر سے میں نے آپ کے سہ ماہی رسالے کا مطالعہ کیا ہے مجھے خوشی ہے کہ ضخامت کے لحاظ سے

مختصر اور سائز کے لحاظ سے کوتاہ قامت ہونے کے باوجود دو .بل
ے یہ شمارے بہت مفید اور قیمتی ہیں۔

پچھلے دو شماروں سے سید احمد دہلوی، مؤلف و مرتب فرہنگ
آصفیہ کے تذکرہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر کے، آپ نے ایک مفید
کام کا آغاز کیا ہے۔ مگر ان دو قسطوں کے مطالعے سے محسوس ہوا کہ اس کی
افادیت اور موجودہ زمانے میں اس کی معنویت اسوقت تک محدود
رہے گی جب تک بہت تفصیل سے حواشی اور تعلیقات کا اضافہ نہ
کیا جائے۔ خاص طور پر جن شعراء کے تذکروں میں ضروری تاریخیں
نہیں دی گئی ہیں، ان کا اضافہ کیا جائے، اور جہاں صرف سنہ ہجری دیا
گیا ہے وہاں تاریخوں کا اضافہ کیا جائے اور ساتھ ہی تاریخ عیسوی
بھی دی جائے، اور جن تاریخوں میں اختلاف ہے ان میں سے جو آپ
کے نزدیک صحیح ہو حوالے اور دلائل کے ساتھ اس کو شائع کیا جائے
ارشد کاکوی مرحوم کے نمبر سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ
مرحوم کے نام اہم ادیبوں اور شاعروں کے خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ آپ کے
پاس محفوظ ہے۔ چونکہ آجکل میں اردو خطوط پر کام کر رہا ہوں اسلئے
میری درخواست ہے کہ براہ کرم ان کو جلد سے جلد شائع کر کے اردو کے
مکتوباتی ادب میں مفید اضافہ کیا جائے۔ والسلام۔ نیازمند عبد اللطیف اعظمی

(۹) ڈاکٹر ممتاز احمد | ارشد کاکوی نمبر

ارشد کاکوی کے متعلق عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ
اگر وہ شعلہ مستعجل نہ ہوتے تو شاید اردو ادب میں وہ ابتک
ایک خاص مقام حاصل کر لیتے گرچہ تھوڑی ہی مدت میں وہ
ادبی حلقوں میں روشناس ہو چکے تھے، لیکن افسوس ہے کہ وہ
زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے، ان کی فطرت کے بارے میں
نظیر صدیقی نے لکھا ہے کہ ارشد طبعاً رومانی اور رند مشرب
واقع ہوئے تھے، انہوں نے عاشق کا محبت پرست دل اور
رند کی آزاد رو فطرت پائی تھی، اپنی آزاد روی کے باوجود
کسی کا بن جانا اور کسی کو اپنا بنا لینا ان کی افتاد طبع کا سب سے
اہم تقاضا تھا۔

ارشد کاکوی ایک اچھے استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک
اچھے صحافی بھی تھے۔ وہ روزنامہ "پاسبان" ڈھاکہ میں ایک
فکاہیہ کالم "شیشہ وتیشہ" بھی لکھا کرتے تھے وہ خود بھی ایک
ادبی رسالہ "ندیم" ڈھاکہ سے نکالا کرتے تھے۔ کالج کی ملازمت،
"ندیم" کی ادارت، "پاسبان" کی کالم نویسی، شعبہ صحافت کی جز وقتی
لکچرر شپ کے علاوہ علمی وادبی نشستوں اور جلسوں میں شامل ہونا

اور اس کا انعقاد واہتمام کرنا بھی ارشد کاکوی مرحوم کا فریضہ تھا۔ اسی لئے ڈاکٹر مسعود لیب شادانی نے ارشد کاکوی کو ایک پیکر عمل اور جہد مسلسل کا نام دے رکھا تھا۔ لیکن کیا کیجئے کہ زندگی کی صرف چھتیس ۳۶ بہاریں دیکھ کر ۹ ار فروری ۱۹۶۲ء کو ارشد کاکوی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

ارشد کاکوی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۲ء سے ہوا۔ ابتدا میں بھی انہوں نے غزلیں لکھیں اور اس کے بعد تنقید۔ ان کے مضامین اور نظم و نثر رسائل نگار لکھنؤ، آج کل دہلی، امروز کراچی اور شاعر بمبئی میں کثرت سے شائع ہوئے۔ انہوں نے دوہے بھی کافی لکھے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے دل پر حزن والم محرومی و مایوسی کی جو کیفیتیں گذری تھیں انہیں دوہے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

ارشد کاکوی کے مقالوں کا ایک مختصر سا مجموعہ تنقید و تشخیص شائع ہو چکا ہے اور ان کے مضامین کا ایک نیا مجموعہ سنگ دوستی کے نام سے عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے اور ان کے کچھ اشعار سلسلہ شعرا بہار کے تحت شائع ہو چکے ہیں۔

ارشد کاکوی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

تمہارے ہونٹوں پر کانپتی ہے ہمارے کانوں میں گونجتی ہے
جو بات تم نے کہی نہیں ہے جو بات ہم نے سنی نہیں ہے

مجھے تم اچھے لگے میں نے کہہ دیا تم سے
عجیب ہے مری فطرت کی سادگی اے دوست!

سوز کا رونا دھونا ارشد ختم کرو سب جاتے ہیں
دکھ کا رونا تو وہ روئے جس نے سکھ بھی پائے ہوں

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسالہ سفینہ نے ارشد کاکوی مرحوم کا نمبر شائع کرکے اپنی بساط بھر جو انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی وہ لائق مبارک باد ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ عنقریب ہی سفینہ کے اشاعتی پروگرام میں ارشد کاکوی مرحوم کے مضامین کا مجموعہ اور ان کی نظم و نثر کا مجموعہ منظر عام پر آجائے گا تاکہ صاحبان ذوق کی تشنگی بجھ سکے۔ سہ ماہی رسالہ سفینہ کے ارشد کاکوی نمبر کی قیمت دس روپے ہیں۔ اور اسے گل مہر پبلشنگ بک ہاؤس سبزی باغ پٹنہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ)

(۱۰) حمید الرحمٰن
سعودی عرب

سفینہ میری نظر میں

شکل و صورت، طباعت و کتابت کچھ بھی ہو مگر جو خوبصورتی اور جاذبیت اس رسالہ میں پائی وہ اب تک اچھے اچھے رسالوں میں نہیں دیکھی۔ نگار اور معارف ٹھوس ادبی پرچے ضرور رہیں پھر بھی ہم جیسے ادب سے نابلد لوگوں کیلئے اکتا دینے والی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں ان پرچوں کا زیادہ مطالعہ نہیں کر سکا اور نہ ادب سے اتنا لگاؤ ہی رہا کہ ادب کے خاطر ہی پڑھتا مگر اس رسالہ میں جو خصوصیت پائی وہ منفرد پائی وہ یہ کہ کوئی سے کوئی شخص بھی پڑھے تو پڑھتا ہی چلا جائے. زبان اور انداز بیان تو اپنی جگہ دلکش ہیں ہی. سب سے بڑی خوبی یہ کہ مختصر صفحات و ضخامت رکھتے ہوئے بھی اسقدر معلوماتی کہ بیان نہیں کر سکتا کاش میں ادیب ہوتا۔ نقاد ہوتا تنقید نگار ہوتا تو مزید کچھ لکھتا۔

پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ہم جیسے بے ذوق لوگوں کو باذوق بنانے کیلئے سفینہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسقدر معلوماتی رسالہ میری نظر سے نہیں گذرا اس زمانے میں جبکہ اردو کا سفینہ ڈوب چکا ہے اور ڈوب رہا ہے۔ اس سفینہ کو دیکھ کر امید بندھتی کہ

نہیں ابھی بھی موقع ہے کہ یہ نئی نسل جو ادب سے کنارہ کرتی جا
رہی ہے اس سفینہ کا سہارا ہی لے تو پھر ادب سے بہت
حد تک ہمکنار ہو سکتی ہے۔

جس انداز سے ادب کی خدمت کا بیڑا اس سفینہ نے اٹھایا
ہے امید افزا ہے۔ ہزار کتابوں سے مطالعہ کے بعد بھی جو بات آسانی
سے اخذ نہیں ہو سکتی وہ اس رسالہ سے فراہم ہوتی جا رہی ہے۔
قدر Short cut انداز میں زیادہ سے زیادہ مواد کہاں
ل پاتے ہیں۔ اہل ذوق تو اپنے ذوق کی تسکین لائبریریوں سے
کتب خانوں سے کر لیتے ہوں گے ہم جیسے لوگوں کو اتنا نہ وقت
ہے نہ موقع نہ صلاحیت پھر بھی یہ سفینہ مجھے بہت کچھ دے گیا جن
نوں سے کہ میں نابلد تھا، تو پھر وہ نسل جو ابھی زیر تعلیم ہے انکے
ہ کیا کچھ نہ دے گا۔ دوسری خوبی یہ کہ مکمل ادبی اور خالص ادبی
ہتے ہوئے ایک سے دو، دو سے تین تک تو دیکھ کر آیا سامنے لیکر
با چوتھے شمارے کی خبر سنی، پانچویں کی تیاری۔ اسقدر کہاں چل پاتے
ہ میں تو سیکڑوں ایسے گذرے جو ایک سے دو شمارے تک آتے ہوئے
ہو گئے، اچھے اچھے اخبار رسالے بھی بغیر کسی اشتہار اور جنسی، رومانوی جاسوسی
امکے کہاں چل پاتے ہیں۔

دو آتشہ

(۵)

غالب

شکوہ از خوئے دوست نتواں کرد
بادۂ تند سازگار تر است

بہ التفات نیرزم در آرزو چہ نزاع
نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی است

پیش ازینکہ بود ایں ہم التفات بود ولے
ایں قدر بر خود نبالیدے بحالش ہیچ

داغِ دل ما شعلہ فشاں ماند بہ پیری
ایں شمع شب آخر شد و خاموش نگردید

خوش آں کس کہ با خویش جز غم ندارد
ولے خوشتر است آں کہ ایں ہم ندارد

ہم چو رازے کہ بمستی ز دل افتد بیروں
در بہاراں ہمہ بوئیت ز صبا می آید

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوئے
گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

حالی

دوست کی خوئے بد کا شکوہ کیا
تند بادہ ہے سازگار بہت

نہ التفات سہی آرزو کا کیا شکوہ
غریب کو طلبِ کیمیا ہی میں ہے نشاط

اتنا بھی ارتباط جب ہے پہلے تھا کہاں ؟
کیوں دل کو اس کی پرسشِ بیجا سے رنج ہو

پیری میں بھی ہے شعلہ فشاں داغِ دل اپنا
ہونے کو سحر ہو گئی اور گل نہ ہوئی شمع

کتنا خوش بخت ہے رکھتا نہیں جو غم کے سوا
جس کو یہ بھی نہ ہو اس کا تو ہے کہنا ہی کیا

جس طرح مستی میں دل کا راز ہو جاتا ہے فاش
ویسے ہی بادِ صبا سے تیری بو ہے آشکار

خرد سے میں نے پوچھا اہلِ معنی کا نشاں کیا ہے
کہا اس نے کہ جیب گفتار سے کردار مل جائے

کلام موجودہ شعرائے بہار

(۳)

منزل کہاں ہے تیرے مسافر کی راہ میں ؛ ہر ہر قدم پہ راہ نئی ہے نگاہ میں
(انتہا محمد ارشاد)

زباں ہے لفظ و بیاں داستاں کا کام نہیں ؛ معاملہ ہے نظر کا زباں کا کام نہیں
(ظہیر صدیقی)

پسینہ اپنی جبیں سے تو پونچھیئے پہلے ؛ یہ کیوں وفا کی قسم آپ کھائے جاتے ہیں
(ظہیر احمد سعودی)

کرو ہے اے وحشت گریباں چاک چاک ؛ اہل دنیا کو تماشا چاہیے
(کوثر سیوانی)

کام کرنے کو بہانہ کچھ نہیں ؛ کچھ نہ کرنے کو بہانہ چاہیئے
(اختر کاکوی)

بکھر گیا ہے اندھیرا تمام راہوں میں ؛ وہ لوگ کیا ہوئے جو مشعلیں جلاتے تھے
(ارمان نجمی)

لبوں پہ موج تبسم نظر میں رنگ حیا ؛ اب اور چاہیئے کیا شان دلبری کے لئے
(ہوش عظیم آبادی)

ڈھونڈتے ہیں آپ پیری میں جوانی کی امنگ ؛ پھول میں خوشبو کہاں رہتی ہے مرجھانے کے بعد
(ڈاکٹر مراد خان اثر منیری)

کہا جو چھپتے ہو حال مرے دل کا شب غم ؛ کیا تم نے کبھی گور غریباں نہیں دیکھی
(محمود علی خاں صبا)

سو بار آئینے کو کیا صاف گرد سے ؛ تصویر اپنی دیکھ کے پھر [illegible]
(ظفر امام ظفر کاکوی)

سکت پرواز کی بکھرے بال و پر میں آ ہی جاتی ہے ؛ کبھو صیاد سے جا کر قفس کی تیلیاں [illegible]
(ڈاکٹر احمد سہیل [illegible])

[illegible] محبت سے خالی ؛ کر [illegible] شرمندہ مجھے [illegible]

معیار و میزان (تبصرے)

(۱) **تجلیات ولی** مجموعۂ کلام سید شاہ ولی الرحمٰن ولی سالکوی مرحوم۔

ناشر محمد وصی بیلی کیشر خزانچی روڈ پٹنہ ۴۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۳ء صفحات ۲۵۶

قیمت ۲۵ روپے۔ یہ کتاب ڈیمائی سائز پر صاف اور خوشخط کتابت

اور طباعت سے آراستہ بہار اردو اکادمی کی مالی امداد سے اشاعت پذیر ہوئی

ہے۔ گرد پوش کے آخری صفحہ پر مصنف کی تصویر بھی ہے

ولی سالکوی زبان اردو کے مشہور و معروف شاعر بھی تھے اور تنقیدی

و علمی مقالہ نگار بھی۔ ان کی تخلیقات نظم و نثر آج سے چالیس پچاس سال پہلے

ملک کے معتدد رسالوں میں شایع ہوتے رہے۔ معارف، نگار، جامعہ

ندیم، نقوش وغیرہ میں متعدد مقالے اور منظومات شایع ہو کر خراج

تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ شوق نے آبیاری کی اور

حضرت شاد کے فیض تربیت نے اسے جلا دی۔ غزلوں اور نظموں میں لطافت

شعری، نفاست ادبی، اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ رباعیوں

میں بھی دلکشی اور رعنائی ہے۔ زیر نظر مجموعہ رباعیوں اور منظومات پر

مشتمل ہے۔ ابتدا میں جناب ولی کے بھتیجے صاحب زادے شاہ ریاض احمد

ریٹائرڈ مجسٹریٹ کا تعارفی مضمون بعنوان اعرض مرتب ہے۔ اسکے بعد جناب کلیم الدین احمد کا ایک تبصرہ بطور تعارف ہے۔ ذکر ولی اور ولی کاکوی کے عنوان سے ڈاکٹر ذکی الحق اور ڈاکٹر کلیم عاجز کے تاثرات ہیں۔

کلیم الدین احمد نے اپنے تعارفی مضمون میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے

" ولی الرحمٰن صاحب شاد کے شاگرد تھے لیکن وہ اقبال سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ اور ان کی نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے علاوہ اور بھی اپنے معاصرین سے متاثر ہوئے تھے۔ ان کی غزلوں اور نظموں سے کافی مشق مہارت، پختگی عیاں ہیں۔ ان کا اپنا ایک علاحدہ رنگ ہے۔ وہ صرف دوسروں کی نقالی نہیں کرتے بلکہ اپنے ذاتی خیالات و جذبات کا انفرادی زبان میں اظہار کرتے ہیں۔

ان کی طبیعت موزوں بھی تھی اور وہ ایک فن کار بھی تھے، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ قارئین جو جدیدیت کے دیوانے نہیں ہیں۔ ان کی دلچسپی کیلئے ان غزلوں اور نظموں میں کافی مواد مل جائے گا۔

بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حالیہ دور میں تجلیات ولی ایک دل پذیر اور قابل قدر شعری مجموعہ ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے قارئین اپنے ذوق ادب کی بھرپور تسکین حاصل کر سکیں گے۔

(۲) **صاحقہ اطور** مصنفہ تاج پیامی مجرار خیبہ جغرافیہ پکھ لوئی

جین کالج آرہ۔ ناشر اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد۔ ۲۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۴ء ڈیمائی سائز کے ۲۲۲ صفحات پر مشتمل۔ قیمت ۴۵ روپے۔

یہ کتاب خود مصنف کے اعلان کے مطابق کلیم الدین احمد کے باطل تنقیدی نظریات کی تصحیح ہے۔ جو لوگ کلیم الدین احمد کی انتہا پسندانہ تنقیدی لغزشوں کے شکار ہوئے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بلاشبہ مرہم کا سامان بہم پہنچائے گی۔ تاج پیامی علم جغرافیہ سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ادبی و تنقیدی ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اور اس مطالعہ کی بنا پر کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات کا بھرپور جائزہ لے کر اپنی مدلل رائے پیش کی ہے۔ کلیم الدین احمد لاکھ ناقابل تقلید سہی انہوں نے اس دور کے ناقدین اور خصوصاً نوجوانوں کو اصول تنقید کی جانچ پڑتال کی طرف متوجہ کیا۔ ہر شخص کا اپنا اپنا مطالعہ ہے۔ اور اپنی اپنی سمجھ بوجھ۔ تنقید یکسر کوئی اٹل اصول نہیں رکھتی۔ تاج پیامی نے اپنے موقف کو بڑی دیدہ ریزی، محنت اور دلائل سے آراستہ کر کے پیش کیا ہے۔

جس طرح کلیم الدین کی تحریریں دعوت فکر دیتی ہیں اسی طرح تاج پیامی کے دلائل بھی غور سے پڑھنے کے لائق ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کو تنقیدی توازن کا عرفان حاصل ہوگا۔

بعض تذکرہ نویسوں نے ان کا نام ولی محمد لکھا ہے۔ اواخر
عہد عالمگیری میں دہلی میں تشریف لائے تھے۔ ان کا مشہور
شاگرد بھوبنی سنگھ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دہلی آیا تھا۔ ۱۲۲۷ھ
میں فوت ہوا۔ ولی کی وفات ۱۱۰۱ھ میں ہوئی۔

(۶۰) **وحید** | ہمارے قدرداں کرم فرما مولوی عبدالرؤف صاحب
ولد منشی احمد علی صاحب کلکتوی کا تخلص جنہوں نے حال میں
وفات پائی۔

(۶۱) **وزیر** | خواجہ محمد وزیر لکھنوی خلف خواجہ محمد فقیر تخلص
جنہوں نے ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

ھ

(۶۲) **ہدایت** | ہدایت اللہ خان دہلوی کا تخلص جنہوں نے
۱۲۱۵ھ میں وفات پائی۔

ضمیمہ

سید احمد دہلوی بہ حیثیت شاعر کبھی متعارف نہیں ہوئے۔
ان کی شہرت کا دارومدار فرہنگ پر ہے۔ خود اپنے جو حالات
لکھے ہیں اور دیگر تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

اس میں اپنی شعر گوئی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ مگر فرہنگ میں انھوں نے سنداً مختلف جگہوں پر اپنے تصنیف کردہ اشعار درج کئے ہیں۔ گرچہ یہ مستحسن اقدام نہیں اور نہ مناسب ہی ہے۔ کہ مصنف خود اپنے اشعار سند کے طور پر پیش کرے سند کے طور پر مصنف نے ایسے بہتیرے شعرا کا کلام بھی پیش کیا ہے جو اپنا کوئی خاص مقام نہیں رکھتے۔ خود مصنف بھی بہ حیثیت شاعر کوئی مقام نہیں رکھتے اور ان کے وہ اشعار جو سند کے طور پر پیش کئے گئے ہیں وہ شعری محاسن سے عاری ہیں۔ کسی لفظ کو محض موزونیٔ طبع کی بنا پر شعر کے روپ میں لکھ دینا شاعری نہیں ہے۔

فرہنگ کی ورق گردانی کے بعد باسٹھ اردو کے شعرا کے نام کا پتا چلتا ہے جن کے متعلق مختصر حالات فرہنگ میں ہیں۔ مصنف نے بڑی سہل انگاری اور غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ جو مختصر حالات ہیں بھی وہ اکثر نا قابل قبول اور غیر تشفی بخش ہیں۔ شعرا کے انتخاب میں بھی کوئی ضبط و نظم نہیں۔ بہتیرے ایسے ہیں جو فرہنگ میں جگہ پانے کے لائق نہ تھے اور کتنے ایسے ہیں جو شمولیت سے محروم رہے۔ شعرا کے احوال میں جہاں جہاں تسامحات پائے گئے یا جن باتوں کا ذکر ضروری تھا وہ تعلیقات میں بیان کر دیے گئے ہیں۔

تعلیقات تذکرہ

(۱) آباد | تاریخ ولادت غلط دیا ہے صحیح تاریخ ولادت ۱۲۲۸ھ ہے
واسوخت کے علاوہ متعدد دواوین ہیں۔ ناسخ آتش اور آباد
کی ہم طرحی غزلوں کا ایک مجموعہ بھی شایع ہوا تھا۔ خوش معرکہ زیبا
کی روایت ہے کہ ناسخ سے برگشتہ ہوگئے تھے اور مرزا محسن
سے وابستہ ہوے۔

(۲) آبرو | ان کے زمانہ کو ۱۱۹۵ھ سمجھنا عقل سے بعید ہے۔ ان
کو دہلوی کہنا بھی مناسب نہیں۔ گوالیار وطن تھا۔ بہادر محمد شاہ تک
زندہ رہنے کے تو یہ معنی ہونگے کہ ۱۱۶۱ھ تک زندہ تھے
آبرو کا سال وفات ۱۱۴۷ھ ہے۔ ایک آنکھ سے معذور تھے
ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ محمد غوث گوالیاری کے پوتے نشتہ
بھی اخلاف میں تھے۔

(۳) آتش | ان کے دو دواوین خود ان کی زندگی ہی میں خود
ان کی تصحیح سے ۱۲۶۱ھ میں شایع ہوے۔ پھر ۱۲۶۸ھ
میں دوسرا ایڈیشن نکلا اس میں تقریباً ۳۰ غزلیں مزید شامل
کی گئیں مگر عام متداول نسخوں میں نہیں ملتیں۔ سال

ولادت معلوم نہیں مگر قیاساً ۱۱۹۰ھ متعین کیا جا سکتا ہے
صاحب طرز شاعر تھے۔ رند و صبا وغیرہ ان کے ممتاز شاگرد تھے۔

(۴) **اثل** میر عبد الجلیل بلگرامی فارسی کے نامور شاعر اور میر غلام علی آزاد کے نانا تھے۔ تفریحاً مزاحیہ شعر کہتے تھے اور جعفر زٹلی کے تخلص زٹل کی رعایت سے اثل تخلص رکھ لیا تھا۔ فن موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ ۱۱۳۸ھ میں بمقام دہلی انتقال ہوا۔ بلگرام میں مدفون ہوئے۔ ولادت ۱۰۷۱ھ۔

(۵) **اثر** دسویں صدی ہجری میں ان کا موجود رہنا وہی شخص لکھ سکتا ہے جو صدی کی اصطلاح سے ناواقف ہے۔ خواجہ میر درد کا انتقال ۱۱۹۹ھ میں ہوا۔ یعنی بارہویں صدی کے اواخر میں۔ اثر ان کے جانشین ہوئے ۱۲۰۸ھ میں انتقال ہوا۔ یعنی آخر ہویں صدی کے اوائل یا آخر کا سال ولادت ۱۱۳۵ھ ہے۔ ان کی مثنوی کا نام خواب و خیال ہے۔ صاحب دیوان تھے۔ مثنوی اور دیوان دونوں چھپ گئے ہیں۔

(۶) **احسان** شاہ عالم بادشاہ کے بیٹے مرزا اخترہ بخت کے استاد اور مختار تھے۔ صاحب دیوان تھے اور بہتوں کے استاد۔

(۷) **اختر** آخری تاجدار اودھ۔ ولادت ۱۲۳۸ھ۔ اپنے

والد امجد شاہ کے انتقال کے بعد ۱۲۶۳ھ میں تخت نشین ہوئے۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں معزول ہو کر کلکتہ بھیجے گئے۔ مٹیا برج میں وظیفہ ملتا رہا اور شاہانہ زندگی بسر کرتے ہوئے سنہ ۱۳۰۴ھ میں انتقال کیا۔ مزار مٹیا برج میں ہے۔

(۸) **اختر** ان کا تذکرہ شعرائے فارسی بنام آفتاب عالم تاب نا پید سمجھا جاتا تھا اب وہ دستیاب ہو گیا ہے۔ ان کی ولادت ۱۲۳۸ھ میں اور وفات ۱۳۰۴ھ میں ہوئی۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔

(۹) **ارشد** مرزا قادر بخش صابر کے شاگرد تھے۔

(۱۰) **آرزو** ولادت ۱۰۹۹ھ میں ہوئی۔ انتقال لکھنؤ میں ہوا مگر دہلی میں مدفون ہوئے۔ ماہر لسانیات تھے۔ میر کے والد کی پہلی شادی آرزو کی بہن سے ہوئی تھی دوسری شادی میر کی والدہ سے ہوئی۔ یہ میر کے سوتیلے ماموں نہ تھے بلکہ میر کے سوتیلے بھائی کے حقیقی ماموں تھے۔

(۱۱) **آزاد** آزاد کا انتقال سنہ ۱۹۰۰ء میں نہیں بلکہ ۱۹۱۰ میں ہوا۔ مصنف کی واقفیت حیرت انگیز ہے۔

(۱۲) **آزردہ** وفات ۱۲۸۴ھ میں ہوئی۔

(۱۳) اسیر امیٹھی کے رہنے والے نام تاریخی "مظفر" (۱۲۲۳ھ)۔ واجد علی شاہ کے مصاحب رہے۔ پھر رام پور چلے گئے ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔

(۱۴) آشفتہ ان کا تذکرہ بہ حیثیت شاعر فرہنگ میں ضروری نہ تھا۔

(۱۵) آفتاب تخت نشینی ۱۱۷۲ھ۔ نظم و نثر دونوں لکھتے تھے غلام قادر روہیلہ نے آنکھیں نکلوا دیں۔

(۱۶) امانت ان کی زبان میں لکنت تھی۔ خود مراثی نہیں پڑھ سکتے تھے

(۱۷) امیر شاہ مینا کی اولاد میں تھے۔ ولادت ۱۲۴۴ھ اور وفات ۱۳۱۸ھ حیدرآباد میں ہوئی۔ مصنف فرہنگ ان سے تاثر رکھتے تھے۔ امیر مینائی کی ایک تصنیف امیر اللغات بھی ہے مراۃ الغیب اور صنم عشق کے علاوہ اور تصانیف بھی ہیں۔ رام پور میں بڑے عہدے پر فائز

(۱۸) انشا ان کو مصحفی کا شاگرد سمجھنا حماقت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ رنگین سے ریختی سیکھنا بھی غلط ہے دونوں ہم مشق تھے۔ دریائے لطافت کی تالیف میں قتیل بھی شریک تھے۔ انشا مرشد آباد میں پیدا ہوئے

(۱۹) انور ذوق کے دیوان کی ترتیب میں یہ بھی شریک تھے خوش نویس تھے۔ اور اچھے شاعر۔

(۲۰) **انیس** | ۱۸۰۳ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے مگر لکھنؤ رہے۔

(۲۱) **اوباش** | فرہنگ میں اسکی شعوریت نیز ضروری تھی۔

(۲۲) **بیدار** | انتقال ۱۲۰۹ھ۔ دیوان مطبوعہ ہے۔

(۲۳) **تاباں** | مرزا مظہر جانجاناں سے بڑا ربط ضبط تھا۔ ۱۲۰۹ھ تک ان کو زندہ سمجھنا بڑی نادانی ہے۔ وفات ۶۳ ۱۱ھ کے لگ بھگ کثرت شراب نوشی کے بعد یکایک ترک کر دینا موت کا باعث ہوا۔

(۲۴) **تسکین** | مومن کے ہم عصر تھے۔ رام پور میں وفات ہوئی۔

(۲۵) **ثاقب** | ولادت ۱۸۴۰ء۔ وفات ۱۹ اپریل ۱۹۱۹ء/ ۱۲۸۶ھ سائل دہلوی کا شاگرد داغ ان ہی کے بیٹے تھے۔

(۲۶) **جان صاحب** | عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔ آخر میں رام پور میں قیام رہا اور وہیں انتقال ہوا۔ کسی نے ان کو میر کا کسی نے ناسخ کا شاگرد لکھا۔ غلط ہے۔ کلام پڑھنے کا خاص انداز تھا۔

(۲۷) **جرأت** | جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے۔ میر نے جرأت کی شاعری کو چوما چاٹا ہوا شاعری کہا تھا۔ ان کا انتقال ۱۲۲۴ھ میں ہوا۔ یعنی میر تقی میر کے انتقال سے کچھ پہلے۔

(۲۸) **حالی** | ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ حضرت ایوب انصاری سے سلسلہ نسب چلتا ہے۔ خواجہ

عبداللہ انصاری بھی اسی سلسلے میں ہیں۔ شیفتہ کے محبت یافتہ اور ان کے بیٹے کے اتالیق رہے۔ لاہور میں ملازم رہے پھر سرسید سے روابط پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء/ ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ پانی پت میں انتقال ہوا۔ مقدمہ شعر و شاعری ان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ حالی کی پوتی مشتاق فاطمہ کا نکاح غلام الثقلین سے ہوا جن کے بیٹے غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین (بیٹی) مشہور و معروف ہیں۔

(۲۹) حیا: ان کے والد کا تخلص رسا تھا۔ حیا رام پور میں بھی رہے۔ نظم و نثر میں ماہر تھے۔ گلستاں سخن ان کا نہیں بلکہ مرزا قادر بخش صابر کا ہے۔ ظہیر اور ذوق کے شاگرد تھے۔

(۳۰) خسرو: فرہنگ میں خسرو سے متعلق اتنی طول بیانی غیر ضروری تھی۔ ان کے حالات کتابوں میں مندرج ہیں۔ سعدی خسرو سے ہندوستان آکر ملاقات کرنا بے بنیاد ہے جس شعر سے یہ استدلال کیا گیا ہے وہ اس بات پر مشعر نہیں۔ خسرو نے اپنے والد کے انتقال پر جو شعر کہا وہ ضروری نہیں کہ ۹ سال کی عمر میں کہا ہو۔ کمسنی میں حضرت نظام الدین کی خدمت میں جانا

اور رباعی کا تبادلہ ایک ہی قافیہ میں ہونا محض داستان ہے۔

(۳۱) داغ | داغ کے انتقال کا صحیح سال ۱۳۲۲ھ ہے۔ تاریخ کا مصرعہ
مادّہ ہے اس سے بھی یہی سال نکلتا ہے۔ ولادت ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ
ان کی ایک مثنوی فریادِ داغ بھی ہے۔ قلعہ معلی میں پرورش پائی۔
عرصہ تک رام پور میں رہے پھر حیدر آباد میں۔ غالب رشتے میں
ان کے پھوپھا ہوتے تھے۔

(۳۲) دبیر | بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ علم شاعری پر عبور تھا۔

(۳۳) درد | درد نہیں بلکہ ان کے والد گلشن کے مرید تھے۔ ولادت
۱۱۳۰ھ میں نہیں بلکہ ۱۱۳۳ھ میں ہوئی۔

(۳۴) ذوق | ولادت ۱۲۰۳ھ۔ دیوان ان کی زندگی میں شایع
نہ ہو سکا بعد میں پہلے حافظ ویران وغیرہ نے مرتب کرکے شایع
کیا پھر آزاد نے کچھ اپنے اضافے کے ساتھ شایع کیا۔

(۳۵) راسخ | لکھنو اور کلکتہ وغیرہ بھی گئے تھے۔ شاد نے ان کا
سال ولادت ۱۱۶۲ھ بتایا ہے جو غیر معتبر ہے۔ ۱۱۷۰ھ کے
لگ بھگ پیدا ہوئے۔ مزار پٹنہ میں ہے۔ ان کا قلمی دیوان
اور جگہوں کے علاوہ لکھنو یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

(۳۶) راسخ | ان کا وطن تبت (کذا) ہونا مشکوک ہے۔ شاید کوئی دوسرا
مقام ہو۔

(۳۷) رند | والد کا نام نواب سراج الدولہ غیاث الدین خاں نصرت جنگ۔ ۱۲۱۲ھ ولادت۔ ان کی پردادی نواب برہان الملک کی بہن تھیں اس رشتے سے فیض آباد میں یہ بڑے ناز و نعم سے پلے۔ آتش کے مشہور شاگرد تھے۔ انتقال کا صحیح سال معلوم نہیں قیاساً ۱۲۶۸ھ قرار پاتا ہے۔

(۳۸) رنگین | باپ کا نام محکم الدولہ طہماسپ بیگ تورانی الاصل انشا کے دوست اور حاتم کے شاگرد تھے۔ بڑے پرگو شاعر اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ ۱۲۵۱ھ میں انتقال ہوا۔ پٹنہ بھی گئے تھے۔

(۳۹) زکی | ۱۸۳۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور مصنف عمدۂ منتخبہ کے نواسے تھے۔ غالب اور صہبائی کے شاگرد تھے۔ آخر میں بدایوں میں قیام پذیر رہ کر ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا۔ خود مصنف فرہنگ ان کے شاگرد تھے۔ لیکن انھوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ دیوان ان کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا۔

(۴۰) سودا | یہ ۱۱۰۸ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ۱۱۷۵ھ میں دہلی کو خیرباد کہہ کر فرخ آباد گئے اٹھارہ سال رہ کر ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد پہنچے اور ۱۱۹۵ھ میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

(۴۱) سوز: پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ میر تقی کا تخلص بھی میر تھا
اسلئے اپنا تخلص سوز بدل دیا۔ ۱۲۱۳ھ میں انتقال ہوا۔
آصف الدولہ کے استاد تھے۔
(۴۲) صبا: ان کا دیوان غنچہ آرزو چھپ گیا ہے۔ گھوڑے سے گر کر
۱۲۸۲ھ میں وفات پائی۔ باپ کا نام بندہ علی تھا۔
(۴۳) ضاحک: میر حسن کے باپ اور میر انیس کے پردادا
تھے۔ دیوان نایاب تھا اب بتیا (بہار) میں دستیاب ہوا ہے
دہلی سے فیض آباد منتقل ہو گئے تھے۔ میر حسن خلیق ان کے بیٹے تھے
(۴۴) غالب: مصنف فرہنگ نے اس مشہور و معروف شاعر
کے سنین ولادت و وفات دونوں غلط قلمبند کئے ہیں۔
تعجب ہے۔ دہلی ہی میں رہ کر یہ عدم واقفیت ان کی سہل
انگاری اور غفلت پر دال ہے۔ غالب ۱۷۹۷ء میں
پیدا ہوئے اور ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔ سال ہجری
علی الترتیب ۱۲۱۲ھ اور ۱۲۸۵ھ ہے۔
(۴۵) مجروح: ان کی پیدائش ۱۸۳۳ء کے لگ بھگ ہوئی
مرنے سے پہلے ہی نابینا ہو گئے تھے۔ وفات ۱۹۰۳ء
/۱۳۲۱ھ میں ہوئی ان کا دیوان "مظہر معنی" ۱۸۹۹ء میں چھپا

مصحفی
۴۶) مصحفی | الاسکے آٹھ دواوین اردو میں ایک فارسی میں تین
تذکرے عقد ثریا تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحا یادگار ہیں۔
شاگردوں کی تعداد سو سے بھی متجاوز انشاسے خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں

۴۷) مظہر | باپ نے یا شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کا نام جان جاں
رکھا تھا۔ کثرت استعمال سے جانجاناں مشہور ہو گئے۔ ولادت ۱۱۱۱ھ کے
لگ بھگ۔ یہ زخمی ۱۰ محرم کو نہیں بلکہ ۷ محرم کو ہوئے۔ تین دن
کے بعد وفات پائی۔ وفات کا سال ۱۱۹۹ھ نہیں بلکہ ۱۱۹۵ھ ہے۔

۴۸) معروف | غالب کے خسر تھے اور نواب احمد بخش رئیس
فیروز پور کے چھوٹے بھائی شاہ نصیر کے شاگرد۔ وفات ۱۲۴۲ھ
میں ہوئی۔ ۱۲۴۴ھ غلط ہے۔ ایک دیوان چھپ چکا ہے دوسرا
غیر مطبوعہ ہے۔

۴۹) ممنون | میر قمر الدین منت کے بیٹے۔ دہلی میں سکونت تھی۔
اجمیر میں صدر الصدور رہے۔ عرصہ تک لکھنؤ میں بھی رہے۔
شاعر شیریں زبان ہند "تاریخ وفات ہے۔

۵۰) مومن | علم نجوم سے خاص شغف تھا۔ ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے
ان کا دیوان ان کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا۔ صاحب طرز شاعر
تھے۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے پھر منحرف ہو گئے۔

(۵۱) **میر** | خان آرزو کے ہمشیرزادہ نہ تھے۔ میر کی ماں کو آرزو سے
کوئی جہت نہ تھی۔ آرزو میر کے سوتیلے بھائی کے حقیقی ماموں تھے
میر ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن آگرے میں گزرا۔ جوانی چھ
دلی میں اور بڑھاپا لکھنؤ میں۔ ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ گئے اور وہیں
۱۲۲۵ھ میں (لانہ کہ ۱۲۵۲ھ) فوت ہوئے۔ چھ دیوان اردو
ایک فارسی، ایک تذکرہ شعرا اور ایک آپ بیتی کے مصنف تھے۔

(۵۲) **ناسخ** | فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنا کوئی شاعرانہ جرم نہیں۔
اسکے معتقد سب ہوئے ہیں۔ ناسخ کی ولادت لگ بھگ
۱۱۸۵ھ میں ہوئی۔ ان کی عمر ۶۹ سال کی تھی ان کے تین دواوین
ہیں اور مثنویاں اپنے عہد کے جگت استاد تھے۔ اصلاح زبان
کے پھیرے میں شاعری کے حسن و جمال کو کھو بیٹھے۔

(۵۴) **ناظم** | غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۱۶ء/۱۲۳۲ھ
میں ہوئی۔ وفات بہ عارضہ سرطان ۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ میں ہوئی
ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مومن
سے بھی اصلاح لی تھی۔

(۵۵) **نسیم** | دہلی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ میں قیام پذیر رہے دیوان
شائع ہو گیا ہے مومن کے شاگردوں میں سب سے بہتر تھے۔

(۵۶) **نسیم** | ان کا مسلمان ہونا ثابت نہیں۔ مثنوی کے علاوہ دیوان بھی شائع ہوا ہے۔ نسیم کی ولادت ۱۲۲۶ھ میں ہوئی اور وفات ۱۲۷۱ھ میں۔ مثنوی ان کی زندگی ہی میں ۱۲۶۰ھ میں طبع ہوئی۔

(۵۷) **نصیر** | اپنے وقت کے جگت استاد تھے۔ ذوق اور مومن تو شاگرد تھے ہی غالب کے بھی استاد تھے مگر یہ امر بہتوں کو معلوم نہیں یہ عجیب بات ہے کہ تینوں ان سے منحرف ہو گئے۔ "مر ایا گل" ان کے مرنے کی تاریخ ہے۔ ان کا دیوان تمکین کے بیٹے آہی نے مرتب کیا۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے۔

(۵۸) **نظیر** | نظم نگار کی حیثیت سے انھوں نے شہرت حاصل کی۔ ان کے والد محمد فاروق پٹنہ کے کسی رئیس کے ہاں ملازم تھے۔ نظیر دہلی میں پیدا ہوئے پھر اکبرآباد (آگرہ) آ رہے۔ معلمی پیشہ تھا۔ ان کا کلیات مکمل طور پر شہباز عظیم آبادی نے مرتب کر کے چھپوایا اور ان کی سوانح عمری بنام "زندگانی بے نظیر" بھی۔ اپنے رنگ میں یکتا تھے۔ ۱۲۴۶ھ میں انتقال کیا۔

(۵۹) **ولی** | :- ان کی ولادت کی صحیح تاریخ متعین ہے نہ وفات کی۔ نام میں بھی اختلاف ہے اور وطن میں بھی۔ سال وفات ۱۱۱۹ھ کا ثبوت ملتا ہے اور وطن گجرات ہونے کا۔ عہد عالمگیری میں

دہلی ۱۲۱۱ھ میں آئے تھے۔ شمالی ہند کے شعرا کو ان کے دیوان نے متاثر کیا۔ ان کا دیوان گارسن وتاسی نے فرانس میں شائع کیا

(۴۰) **وحید** ان کا خاندان شاہجہاں کے زمانہ میں دہلی سے عظیم آباد آیا۔ پھر بنگال بہ مقام کلکتہ جا کر بسا۔ وحید عربی، فارسی اور انگریزی میں دست گاہ رکھتے تھے۔ گورنمنٹ کے محکمے میں مترجم تھے۔ ان کی مختلف تصانیف ہیں۔ زیادہ تر فارسی میں لکھتے تھے۔ الفت حسین فریاد عظیم آبادی کے شاگرد رشید تھے

(۴۱) **وزیر** ناسخ کے شاگرد تھے۔ صاحب دیوان تھے اور کلام اچھا ہوتا تھا۔

(۴۲) **ہدایت** خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اوصاف حمیدہ سے متصف پاکباز، مرنجاں مرنج علاوہ منجبہ کے مصنف قاسم ان کے شاگرد تھے۔ صاحب دیوان تھے۔

نوٹ

فرہنگ میں تاباں (۲۳ ۱) کے حالات میں آخر میں مندرجہ ذیل عبارت بھی تھی۔ جو غلطی سے حذف ہو گئی "جو صاحب دیوان ہے۔ افسوس کہ عنفوان شباب میں معشوق حقیقی کا وصال میسر ہوا کہتے ہیں کہ حضرت ۱۲۹۷ھ تک زمرہ وحی جو ور تھے"

احوال مؤلف

سید احمد دہلوی کے آباؤ اجداد سادات بخارا، حسنی و حسینی
سید حضرت عبدالقادر جیلانی سے منسلک تھے۔ انھیں بزرگوں میں سید سلیمان
شاہ مصنف کے مورث اعلیٰ تھے۔ جو موضع بار ضلع مونگیر میں مسکن
گزیں ہوئے ان کی آٹھویں پشت میں سید احمد ہوئے۔ ان کے والد سید عبدالرحمٰن
بہ غرض تعلیم دہلی گئے اور وہیں عقد نکاح کر کے مستقل رہنے لگے سید احمد
۱۹ محرم ۱۲۶۲ھ مطابق ۸ جنوری ۱۸۴۶ء بلاقی بیگم کے کوچے میں پیدا
ہوئے۔ سید احمد کا ننہالی خاندان عرب سرائے میں رہتا تھا۔ سید احمد
کثیر التصانیف تھے۔ زبان و علم زبان خصوصاً لسانیات سے شغف کی بنا پر
ایک گراں قدر لغت فرہنگ آصفیہ کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں مرتب
کیا۔ اپنی بساط کے موافق بڑی محنت کی مکان میں آتش زدگی کی بنا پر
سخت نقصان اٹھائے یارے نظام حیدر آباد کی فیاضیوں کی بدولت
یہ کام انجام پذیر ہوا مصنف نے تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد
۱۸۹۲ء میں یہ لغت مرتب کیا باوجود بہتیری خامیوں کے یہ بہر حال قابل
فخر کارنامہ ہے۔ مصنف کو بہاری مصنفین کی صف میں جگہ دینا بربنائے
عظمت بہاریت تو حقیقت سے بعید ہے۔ انتقال شاید ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ یہ شاعر
بھی تھے۔ اور سید تخلص تھا۔

سفینۂ ادب کا ترجمان

دو ماہی

سفینہ

شمارہ ۲ (۱۲)

جولائی ــــــ اگست ۱۹۸۴ء

فہرست

مدیر

عطا کاکوی

قیمت تین روپے Rs 3/-

ملنے کا پتہ: [illegible] پٹنہ

۲

معروضات

۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء کا سورج پٹنہ میں اپنی نئی چمک دمک کے ساتھ نکلا۔ مبارک ہو اردو کو کہ اس سرزمین میں عرصے سے اپنا گھر بنانے کا عزم دہرایا گیا "اردو بھون" کا سنگ بنیاد وزیر اعلیٰ کے مبارک ہاتھوں سے ایک جشن عظیم کے ساتھ رکھا گیا۔ ایک مدت کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر ملی اور امید ہے کہ یہ تعبیر مکمل تعمیر کی شکل میں بہت جلد نمودار ہوگی۔ اب اس گھر کو سجانا، بسانا، آباد کرنا اردو قوم کے ذمہ ہے۔ انجمن بھی ہو، اکادمی بھی ہو، لائبریری بھی ہو سب کچھ ہی اگر ہم اردو بولنے اور لکھنے والے اس چمن اردو کی آبیاری نہ کرینگے تو پھل پھول کی توقع رکھنا فعل عبث ہوگا۔

یہ اردو بھون اب ایسی جگہ ہوگا جو علمی و ادبی حلقہ کہا جا سکتا ہے۔ بغل میں گورنمنٹ اردو لائبریری ہے جو اردو کتابوں کا ایک دل پذیر خزانہ ہے۔ وزیر اعلیٰ بہار نے سنگ بنیاد رکھتے ہوئے ایک لاکھ روپے کی رقم اردو کی ایسی کتابوں کی خریداری کے لئے عنایت فرمائی جو تحقیقی اور اعلیٰ تعلیم کے کام آئے۔ یہیں پر خدا بخش پبلک لائبریری بھی ہے جو نہ صرف

ایشیا بھی بلکہ ساری دنیا میں قلمی مخطوطات عربی و فارسی کے لئے مشہور ہے۔ اس ہی پٹنہ یونی ورسٹی کا علاقہ ہے اور اس کی عظیم لائبریری۔ الغرض اردو صوبہ بہار میں اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث اردو کا قابل فخر مرکز ہوگا۔ حکومت نے تو اپنا کام کر دیا۔ دیکھنا ہے کہ اردو قوم کیا کرتی ہے۔

اسی سنگ بنیاد کے جشن کے ساتھ بہار اردو اکادمی نے ایک سمنار (مذاکرے) کا انعقاد کیا جس میں بہار اور بیرون بہار کے اہل قلم اساتذہ اور ماہرین ادب نے شرکت کی۔ سمنار کا موضوع تھا قومی یک جہتی میں اُردو کا حصہ"۔ سمنار اردو لائبریری ہال میں زیر صدارت جناب علی اشرف وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہوا۔ مقالے بڑے دلچسپ تھے دل چسپی سے سنے گئے مگر مفید ہونے کے باوصف نفس موضوع سے بہت کم مقالے عہدہ برآ ہو سکے۔ پھر بھی یہ سمنار بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

---

۱۹ جولائی سنہ رواں کو عظیم آباد کا ایک منفرد ادیب اور علم و فن کا ماہر ہمیشہ کے لئے دنیائے آب و گل کو چھوڑ کر وہاں چلا گیا جہاں سے لوٹ کر کوئی واپس نہیں آتا۔ جناب مظفر حسین اس شہر کے ایک علمی اور متمول خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد ماجد جناب عبدالحکیم صاحب

نامور جاراہیٹ لاتے تھے۔ منظر صاحب ان کے بڑے فرزند تھے۔ پٹنہ ہی میں تعلیم پائی، بی اے ایل ایل بی ہوئے مگر وکالت کے پیشے سے بے نیاز رہی زندگی بھر دگزاری، علم نہ ادب کی دیوی سے دائمی لابلہ رہا۔ مطالعہ کا اوڑھنا بچھونا اور تصنیف وتالیف۔ مشغلہ حیات۔ زبان اور قلم دونوں میں یکساں رواں غضب کے مقرر اور بلا کے ذہین۔ تین کتابوں کے مصنف نکات ادب، فنون لطیفہ؛ در جمالیات اور ہمارا موقف۔ تینوں اپنے رنگ میں منفرد۔ بالغ نظری، ژرف نگاہی وسعت مطالعہ کا تین ثبوت۔ افسوس کہ نام دنمود سے بے پروا شہرت سے بے نیاز، خاموشی کے ساتھ شمع اردو کو روشن کرنے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

سفینہ کے معروضات میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ ایک منصوبہ یہ بھی ہے کہ آگیں ایسے رسالے بھی بالاقساط شائع کئے جائیں گے جو اردو زبان وادب کے لئے مفید ہوں۔ اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سید احمد دہلوی کی مولف فرہنگ آصفیہ نے جن شعرا کا ذکر اپنے فرہنگ میں کیا تھا ان کو یکجا طور پر مرتب کر کے اور تعلیقات کا اضافہ کر کے۔

بالاقساط شائع کیا گیا۔ جو تین اشاعتوں پر مشتمل ہے یعنی سفینہ ۷ ،۸،۹
اور صلا ۔ ۸۰ صفحوں کا یہ رسالہ مکمل ہو گیا۔ قارئین چاہیں تو ان کو سفینہ
سے علاحدہ کر کے کتابی شکل میں محفوظ کر سکتے ہیں۔ الگ سے بھی یہ
رسالہ (تذکرہ شعرائے اردو) دستیاب ہو سکتا ہے جسکی قیمت تین روپیہ

اسی طرح زیر نظر شمارہ ۱۲ سے ایک دوسرے تذکرہ شعرائے
اردو کی اشاعت ہو رہی ہے جس کا نام گلدستۂ نازنینان ہے۔ اس
کا مصنف کریم الدین ہے۔ یہ تذکرہ کم یاب ہی نہیں نایاب تھا۔ اب
پھر اسکی اشاعت ہو رہی ہے تین قسطوں میں یہ بھی مکمل ہو جائیگا صفحات
۴۸ ہونگے ۔

راقم الحروف کی ایک کتاب بنام غلطہائے مضامین حصہ اول
ابھی شائع ہو گئی ہے یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معاصر سہ ماہی (پٹنہ)
میں بالاقساط چھپتے رہے ہے۔ اسکی افادیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان مضامین
کو کتابی شکل میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا۔ جناب شانتی رنجن
بھٹاچاریہ خود مرد میدان تحقیق ہیں انہوں نے اپنی تنقیدی رائے
سے نوازا ہے ناسپاسی ہوگی اگر شکریہ کے ساتھ اس کو یہاں
پیش نہ کر دیا جائے :۔

"ملفوظاتے مضامین (حصہ اول) بار بار پڑھا۔ آپ نے
جو محنت کی ہے اس کے سلسلے میں کیا کہوں؟ یہ کام اتنا
مشکل ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کو تحقیق
سے کچھ واسطہ رہا ہے"
یہ کتاب دفتر سفینہ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ قیمت پندرہ روپے۔

یہ رسال اگست کی ۲ اور ۳ تاریخ خدا بخش خاں کی یاد دلاتی ہے
عمر دہ سعد زہ کہا گیا ہے مگر خدا بخش خاں نے گویا اپنی ایک سانس میں زندگی
کو ابدی بنا دیا۔ ۳ اگست ولادت اور ۳ اگست وفات کی تاریخ
تھی۔ وہ نواب تھے، رئیس نشتیں زمیندار تھے اور نہ جاگیردار
محنت و مشقت سے کمایا اور اپنا سارا تن من دھن قوم پر
نثار کر دیا اور علم کا اتنا عظیم خزانہ آئندہ نسلوں کے لیے مہیا کر دیا
جو نہ صرف بہار اور ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لئے منارۂ علوم
و فنون ہے۔ اسکی قسمت کی بیداری کہئے کہ اس کی امانت ایک ایسے
باصلاحیت جوش طبع، اور باحوصلہ شخص کے ہاتھ میں ہے جن کا نام عابد
رضا بیدار ہے جناب بیدار صاحب نے اپنے دور نظامت میں
اس کتب خانہ کو جو گویا کتابوں کا ایک خاموش مقبرہ تھا اب سچے معنوں
میں بولتا ہوا علمی مرکز بنا دیا ہے۔

یہاں وہاں سے

(۳)

(۲۸) ایک انگریزی ناول کا قدیم اردو ترجمہ

سیموئل جانسن کا ایک ناول ہے جس کا نام تاریخ راسیلاس شہزادہ حبش ہے۔ اس کا اردو ترجمہ کمال الدین حیدر عرف سید محمد میر لکھنوی نے آگرہ اسکول بک سوسائٹی کی فرمائش پر کیا تھا اور آج سے ایک سو پینتالیس (۱۴۵) سال قبل ۱۸۳۹ء میں چھپا تھا۔ یہ نایاب ترجمہ اب دوبارہ بہتر ترتیب اور مفید معلومات سے مزین ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکچرر شعبۂ اردو شبلی کالج نے شائع کیا ہے۔ مرتب کا خیال ہے کہ انگریزی ناول کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ [ماخوذ از معارف جون ۸۴]

(۲۹) **مرزا مظہر کی شاگردی** میر غلام نبی بلگرامی (ولادت ۱۱۱۱ھ) فارسی اور ریختہ کے شاعر تو تھے ہی، ہندی (بھاشا) شاعری کے بھی بڑے فن کار تھے۔ یہ میر عبدالجلیل بلگرامی

(جدنا سید غلام علی آزاد) کے خواہرزادہ تھے اور اس رشتے سے آزاد کے خالہ زاد بھائی ہوئے۔ آزاد نے ان کی بھاشا شاعری پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور سرو آزاد میں اس بات کی اطلاع دی ہے کہ اس فن میں وہ مرزا مظہر جانجاناں کے استاد تھے۔ مرزا مظہر فارسی اور اردو کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ ہندی بھاشا میں ان کا کیا کارنامہ ہے معلوم نہیں۔ آزاد معتبر راوی ہیں، ان کی روایت آسانی سے رد نہیں کی جا سکتی۔

(۳۰) **غالب اور نصیر** جناب ابو محفوظ الکریم معصومی کا ایک مضمون رو سخ ادب بنگال اکادمی کے پہلے شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے غالب کی نادرہ کاری دکھائی ہے کہ خسرو کی ایک فارسی غزل کے تتبع میں غالب نے بھی اسی بحر میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ خسرو کی غزل کی ردیف ہے "چھینی" اور غالب کی "گر یوں"۔ خسرو کی غزل غالب نے دیکھی ہو یا نہیں یہ تو کہنا مشکل ہے مگر غالب نے جس زمین میں طبع آزمائی ہے وہ ان کے "استاد" شاہ نصیر کی ہے جس کو شاگرد نے آسمان پہنچا دیا۔ قارئین کو اچنبھا ہوگا کہ نصیر اور غالب کے استاد!! جی ہاں وہ استاد تھے مگر غالب نے بھولے سے اعتراف نہ کیا۔

تو ہاں نصیر کا مطلع سنئے:

انکی گھٹا ہے کس طرح بوئے وہ زلف اٹھا کے یوں
برق چمکتی کیونکہ ہے ہنس کے یہ بھی کہا کہ یوں

اور غالب کہتے ہیں:-

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

استاد شاگرد سے میلوں پیچھے رہ گئے۔

(۱۳) واجد علی شاہ کا ایک شعر: یہ مشہور شعر واجد علی شاہ سے منسوب ہے۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بیان یہ کیا جاتا ہے کہ جب شاہ مذکور جلا وطن ہونے لگے تو یہ شعر یا تو اسی وقت موزوں کیا یا ان کی زبان سے ادا ہوا۔

جناب نور الحسن صاحب ہاشمی سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے ندرتِ ادب مجلہ بنگال اردو اکاڈمی جلد ۱ شمارہ ۱ میں ایک افسانہ بنام فسانۂ عجائب کا تعارف

کراتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے کہ مذکورہ بالا شعر اس اف نہیں
نقل ہوا ہے اس اف نے کا مصنف عابد علی خاں فریاد کاکوروی کا شاگرد
غالب درد و آتش ہے جس نے ف نہ عجائب سرور کی تقلید میں ۱۲۵۸ء
م ۱۲۵۸ھ میں یہ عہد امجد علی شاہ مرتب کیا اسی اطلاع سے مذکورہ بالا
شعر کی نوعیت اور موقع استعمال مشکوک ہو جاتا ہے۔ واجد علی شاہ
نے ۱۸۵۶ء م ۱۲۷۲ھ میں لکھنؤ کو خیرباد کہا تھا۔

(۳۲) میر حسن اور حزیں راقم الحروف کی مرتبہ کردہ
تالیف غالبیات مضامین حصہ اول مطبوعہ جنوری ۱۹۸۴ء کے صفحہ
۷۴ پر نمبر (۲) کے تحت میر حسن کی فارسی رباعی کے متعلق یہ بحث
چھیڑی گئی تھی کہ شیخ نے کون بزرگ مراد ہیں جنہوں نے اس رباعی کو سن کر یہ دعائیہ
فقرے کہے تھے۔ جناب مسعود حسن رضوی کا خیال تھا کہ آرزو ہیں اور
اسی بنا پر بحث طول کھینچ گئی۔ میر حسن کے مقدمہ دیوان کی عبارت سے
دھوکا ہوا۔ لکھنؤ کی بات ضمناً آ گئی ہے تذکرہ میر حسن مرتبہ جناب اکبر حیدری
کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو گئی۔ خود میر حسن لکھتے ہیں کہ دہلی میں
والد ماجد (طاب ثراہ) نے یہ رباعی شیخ علی حزیں کو سنائی۔ آرزو
کا اس بحث سے کوئی تعلق نہیں دیکھئے تذکرہ میر حسن مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری
(ص ۲۵)

(۳۴۳) ہندستان میں دیوانِ حافظ کی پہلی اشاعت

دیوانِ حافظ کی ان گنت اشاعتیں ہو گئیں۔ ہندوستان میں بھی حافظ بہت مقبول شاعر رہا۔ دیوان کا ایک قدیم قلمی نسخہ مکتوبہ ۸۲۴ ہجری گورکھپور میں ہے۔ مطبوعہ دواوین بھی سیکڑوں بار چھپے۔ سب سے پہلا مطبوعہ دیوان کلکتہ سے آئے۔ اپجان نے ٹائپ میں چھاپا۔ یہ ابوطالب لندنی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اس میں مقدمہ بھی ہے۔ ابوطالب نے مسٹر جانسن کے اعتراض کا جواب بھی لکھا ہے۔ جانسن نے اعتراض کیا تھا کہ حافظ کے کلام میں ابتذال اور امردوں کے عشق کے مضامین بھرے ہوئے ہیں۔ لندنی نے اسکو سمجھایا کہ مشرقی شاعری میں الفاظ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ خدا جانے جانسن کی تشفی ہوئی یا نہیں۔ بہرکیف یہ دیوان نہایت خوب صورت ٹائپ میں ۱۷۹۱ء میں چھپا ہے۔ یہی ٹائپ رائج ہو جاتا تو نستعلیق کی طرح مقبول ہو جاتا۔

(۳۴۴) ناسخ یا مصحفی؟

گزشتہ شمارہ یعنی ۱۱ میں "یہاں وہاں سے" کے عنوان سے جو مضمون ہے اس میں نمبر (۳۴۲) کے تحت ایک شعر جو شمس الرحمٰن فاروقی نے ناسخ کے ساتھ منسوب کر کے میر کے شعر سے مقابلہ کیا ہے اسکے متعلق یہ انکشاف ہوا کہ وہ شعر ناسخ کا نہیں بلکہ مصحفی کا ہے۔ مثنوی بحر المحبت مرتبہ مولانا عبد الماجد دریابادی میں

اس شعر کو مصحفی سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور غالباً یہی صحیح ہے۔ وہ شعر ہے ؎

باغ میں لاگئے ہیں واں سے گل رعنا اب تک
جس جگہ سایہ پڑا تھا تری رعنائی کا

مصحفی کے اُردو دواوین ہیں ان کی ورق گردانی آسان نہیں۔ ناسخ کا دیوان بھی مصحف پیش نظر نہیں۔ جس کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ ان دواوین کی طرف رجوع کرے۔

(۳۵) **آزاد کا ایک ابتدائی رسالہ** محمد حسین آزاد کا ایک مختصر رسالہ ۲۰ صفحات کو محیط ان کے پوتے آغا طاہر نے شایع کیا۔ نام تذکرۂ علما ہے جس میں ۶۹ علما کے مختصر حالات ہیں جن کو آزاد نے بہ زمانہ طالب علمی بطور یادداشت لکھا تھا۔ عبارت سیدھی سادی ہے اور اسی لیے قابل غور ہے کہ ایک عظیم المرتبت ادیب کی ابتدائی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔

(۳۶) **غالب مذاکرہ** عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ کی ایک حالیہ اشاعت سے اطلاع ملی کہ غالب اکادمی دہلی نے ایک نئے مذاکرے کا آغاز کیا ہے جس میں ہر ماہ غالب کے ایک شعر کا جس کا اعلان پہلے ہی سے کر دیا جاتا ہے بھرپور تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اور ادبا و نقادِ دہلی اپنی اپنی رائیں پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک اچھا اقدام ہے۔

اُردُو اور اسکے اساتذہ

(۱) اردو کے معلم ایک عظیم مشترکہ ہندوستانی کلچر کے محافظ، معمار اور اس کے مبلغ بھی ہیں۔ اردو زبان اپنے خمیر میں ہند آریائی اور ہند ایرانی لفظی سرمایہ اور تصورات کے وہ تخم رکھتی ہے جو ہند اور ایران کے مشترک سرمایہ تھے۔
ایسی کشادہ آغوش اور ترقی پسند زبان کے معلم ہونے کی حیثیت سے ہمارے دل بھی کھلے اور ذہن روا داری کے خوگر اور اچھی چیز اختیار کرنے کے لئے تیار رہنے چاہئیں۔ [عبدالقادر سروری]

(۲) اردو کا مستقبل اُردو کے استادوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس قسم کی سیرت کی تعلیم کریں گے اور جس قسم کی اقدار کو فروغ بخشیں گے اسی بنیاد پر قوم اور ملک کی عمارت کھڑی ہوگی۔ انھیں اپنے منصب کو اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا چاہیئے اور اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ اپنے طالب علموں میں آگہی اور بصیرت کا نور اور صحیح ذوق کی چنگاریاں پیدا کریں۔ [خواجہ احمد فاروقی]

(۳) اردو زبان فی زمانہ ہم سے کام کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتی

پیشے سے ہمیں نہ صرف وفاداری برتنی ہے بلکہ ہمارا منصب اس کی وفاداری میں عقل سے زیادہ عشق کا حاجت مند ہے۔ اچھی جگہ، اچھی تنخواہ ہی ہمارا نصب العین نہیں۔ محض ان مادّی قدروں کا حصول ہمارے منصب کے شایان شان نہیں۔ ہمیں ان اعلیٰ قدروں کی طرف بھی نگاہ رکھنی ہے جن کا معاوضہ ہمیں آج نہیں کل حاصل ہو سکے گا۔ اُردو ہماری روٹی ہی کا ذریعہ نہیں۔ یہ ہماری قومی بقا اور تہذیبی ترقی کی علامت بھی ہے۔ یہ ہماری زبان ہے اور اس کا ادب ہمارے اسلاف کی ثقافتی کارگزاریوں کا گراں قدر سرمایہ ہے۔

[سید حنیف]

(۴) اساتذہ کو اپنی قومی تاریخ، قومی تہذیب، علوم کے باہمی رشتوں، عالمی تہذیبی ارتقا کے خاص پہلوؤں اور سماجی ارتقا کے اہم اصولوں سے واقفیت حاصل کرنا ہوگا اور انھیں ادب کے ساتھ ملاکر اس طرح پڑھنا پڑھانا ہوگا کہ ایک سے دوسرے کے سمجھنے میں مدد ملے۔ تعلیم محض معلومات بہم پہنچانے کا نام نہیں ہے۔ کردار سازی بھی اس کا ایک اہم کام ہے۔ ہمیں طالب علموں کی شخصیت کو منور اور جامع بنانا ہے۔ اساتذہ بننا ایک بڑی ذمہ داری قبول کرنا ہے اور اردو کا استاد بننا اس ذمہ داری میں بعض نئے پہلوؤں کا اضافہ کرنا ہے

(۵) آج حالات بدل چکے ہیں اور بدلتے جا رہے ہیں۔ پڑھنے پڑھانے والوں کو اس کا احساس ہونا چاہیے کہ زمانے کے حالات کی تبدیلی سے پرانی اقدار و روایات کی قدر و قیمت بھی گھٹ گئی ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں اساتذہ کو چاہیے نئی نسل کے سامنے فکر و نظر کے دریچے کھولیں اور طلبا کو مناسب طریقہ کار اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔ اردو زبان و ادب کے اساتذہ میں بیگانگی کا احساس زیادہ ہوتا جا رہا ہے یہ ان کی پست ہمتی کی دلیل ہے۔ انہیں چاہیے کہ اپنے فرائض منصبی کے صحیح طور پر ادا کرنے کی قوت پیدا کریں۔ [یوسف کوکن]

(۶) اُردو زبان کے اساتذہ اپنی زبان اور اپنے مقام کا احترام اور اہمیت ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور اس بات پر فخر کریں کہ وہ ایک ایسی زبان و ادب کے خادم ہیں جو بلاشبہ اس ملک کی ایک اہم اور مقبول ترین زبان ہے اور جس کی بقا میں ملک کا اتحاد مضمر ہے سماج کے دلوں میں یہ بھی نقش کرا دینا ہے کہ اردو کی ترقی میں ہندی زبان کی ترقی مضمر ہے۔ [ام۔ اے رضوی]

حسرت کے تنقیدی اشارات

حسرت موہانی سیاست کے پیچ میں گرفتار رہ کر شاعری کی زلف گرہ گیر کے بھی اسیر رہے ۔ فنکار شاعر تھے، تنقیدی نظر رکھتے تھے، زبان و بیان کے محاسن و معائب کی پرکھ تھی ۔ کلام استادانہ ہوتا تھا اور اساتذہ شعرا کے کلام پر غائر نظر تھی ۔ بات چبھتی تلی کہتے تھے ۔ تنقید میں نہ کسی سے دوستی تھی اور نہ دشمنی ۔ حق گوئی شعار تھا ۔ شعرا سے متعلق ان کی رائیں خود اپنی آپ شہادت پیش کریں گی ۔

(۱) ناسخ کا کلام بہ حیثیت فن شاعری نہایت مکمل اور صحیح ہے ۔ لیکن بہ لحاظ لطف شاعری ملاحظہ کیجئے تو ایک گلدستہ ضرور ہے مگر کاغذی پھولوں کا ۔

(۲) مومن دہلوی کا دیوان اٹھائیے تو باوجود زبان اور فن کی لاتعداد کمزوریوں کے آپ اس میں سیکڑوں ایسے اشعار پائیں گے جن کو دیکھ کر دل و دماغ کو فرحت و سرور اور روح کو کشادگی اور بالیدگی حاصل ہوگی ۔

(۳) مومن کے کلام میں جتنی غلطیاں ہیں اتنی شاید ان کے برابر والے ہم عصروں میں سے کسی دیوان میں نہ ملیں گی ۔ اگر اتنی ہی غلطیاں لکھنؤ

کے کسی شاعر سے سرزد نہ ہوتیں تو اس کی نسبت کوئی استادی کا گمان بھی نہ کرتا۔

(۴) جذبات انسانی کی جیسی سچی تصویر مرزا غالب نے بصورت اشعار پیش کی ہے اس کا جواب میر کے بعد کسی دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل سے دستیاب ہو سکے گا۔

(۵) زبان کے پاک و صاف کرنے کی ابتدا شاہ حاتم نے کی تھی۔ سودا نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ انہوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے جیسے علم کیمیا کا ماہر ایک مادے کو دوسرے مادے میں جذب کر دیتا ہے۔

(۶) سودا اور میر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ سودا کے کلام میں جو زور ہے وہ میر کے یہاں نہیں اور میر کے ہاں جو درد ہے وہ سودا کے کلام میں نہیں۔ میر کی طبیعت چونکہ دردمند واقع ہوئی تھی اس لئے ان کی غزل میں کیفیت زیادہ ہے اور سودا کی طبیعت ہمہ گیر اور ہمہ رنگ رکھتے تھے قصیدے میں بڑھ گئے ہیں۔

(۷) کلام کی پختگی، زبان کی صحت اور محاورے کی صفائی میں ذوق کا کلام دہلی کے تمام ہم عصروں سے بدرجہا فائق ہے۔ نادر الکلامی اور مشاق کے زور سے انہوں نے بے رنگی میں بھی وہ رنگ پیدا کر

دکھایا ہے کہ ان کے اکثر اشعار خواص عوام کی زبان پر جاری اور دلوں میں جاگزیں ہیں۔

(۸) اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا درجہ مومن سے بلند ہے لیکن درد و اثر تاثیر میں مومن کا کلام غالب سے افضل اور ذوق سے افضل تر ہے۔

(۹) زبان کے معاملے میں غالب کے دہلوی ہم عصروں میں سے استاد ذوق سب سے زیادہ محتاط ہیں اور اسی لحاظ سے ہمارے نزدیک بہ حیثیت مجموعی غالب ذوق اور مومن سے افضل ہیں لیکن صرف اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا مرتبہ مومن سے بلند ہے۔

(۱۰) دل فریبی خیال اور رنگینی بیان شاعری کے دو خاص جوہر نسیم کو مومن خاں سے بہ حیثیت میراث استاد حاصل ہوئے تھے جن کو انہوں نے بیرا اضافۂ تجدید زبان خوب سے خوب تر بنا کر دنیائے شاعری میں آن بان کے ساتھ پیش کیا کہ لفظ پرستوں نے بھی داد دی۔

(۱۱) اگر قائم سودا کے برابر نہیں تو ان سے کچھ بہت نیچے بھی نہیں۔ یہ رائے سودا کی کوشش اصلاح زبان اور ان کے فیض سخن کے لحاظ سے قائم کی گئی ہے ورنہ استادی سے قطع نظر کر کے قائم کی شاعری

سوداؔ کی شاعری کے ضرور برابر ہے۔

(۱۲) اگر اہل لکھنؤ صفیر بلگرامی کی رائے (زبان کے معاملے میں) سے واقعی اتفاق کرتے ہیں تو ہم کو اس گستاخ دعوی کے اظہار میں مطلق تامل نہیں ہے کہ وہ مذاق سلیم سے یک قلم بیگانہ نہیں۔

(۱۳) جس طرح اہل لکھنؤ نے صحت لفظ کے مقابلے میں لطف زبان کا خیال کم کیا اسی طرح اہل دہلی نے عموماً اور مومن خاں نے خصوصاً بمقابلہ مضمون صحت زبان کی جانب بہت کم توجہ کی چناں چہ غالب ومومن سے لے کر شیفتہ و سالک تک کے دیوان بلکہ اگر غور سے دیکھئے تو ذوق کا بھی کلام غلطیوں سے پاک نہ ملے گا۔

(۱۴) نسیم دہلوی کے کمال شاعری اور استادی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ دہلوی اور اپنے خاص رنگ پر قائم رہنے کے باوجود لکھنؤ میں اور اس لکھنؤ میں جہاں آتش و ناسخ کے دعوی استادی کے سامنے خود وہیں کے اساتذہ نے سپر ڈال دی تھی۔

(۱۵) شاہی زمانے میں شعرائے لکھنؤ کے طبائع پر ناسخ اور پیروان ناسخ کا رنگ اس قدر چھایا ہوا تھا کہ اس کے مقابلے میں نسیم کے دہلوی طرز پر بھی کم از کم ایک حد و دطبقے میں مقبول ہو جانا سراسر حیرت انگیز نظر آتا ہے

صدیق

تلفظ کا مسئلہ

(۱)

اردو املا کی طرح تلفظ کا مسئلہ بھی ذرا پیچیدہ ہے۔ غلط تلفظ سے علم کا بھرم جاتا رہتا ہے۔ زبان کا وقار رخصت ہو جاتا ہے علمی حلقوں میں ہنسی اڑتی ہے۔ آئندہ نسلوں کے لئے وہی غلطی سند بن جاتی ہے۔

تلفظ کا تعلق سماعت سے ہے۔ کتابوں میں لکھا ہوا کوئی لفظ صحیح طور پر پڑھا نہیں جا سکتا جب تک اس پر اعراب نہ لگائے جائیں۔ کلام مجید آپ صحیح طور پر پڑھ نہیں سکتے اگر اس میں اعراب کارفرما نہ ہوں۔ اردو کا میں اعراب کا انتظام بہت مشکل ہے۔ حروف کی ساخت مختصر۔ زیر، زبر، پیش کہاں کہاں لگائے جائیں۔ اب جبکہ اعراب نہ ہو تو نثری تحریر میں تو صحت و غلط صوت کا امتیاز مشکل ہے۔ عوام تو عوام اکثر خواص اور نہ صرف تعلیم یافتہ بلکہ تعلیم دینے والوں کو بھی تلفظ کے معاملہ میں غیر محتاط پایا جاتا ہے۔ نثر کو نثرا اور نظم کو نظم سنتے سنتے کان پک گئے ایسے بیسوں سہ حرفی الفاظ ہیں جن میں دوسرا حرف ساکن ہے مگر عموماً

اسکو حرکت دے کر بیجا حرکت کے مرتکب کیوں بنیں۔

یہ صحیح تلفظ کا پتا صرف اشعار میں چل سکتا ہے۔ اور ان دو بحور سے غلطی کی گرفت ہو جا سکتی ہے مگر اب اس دور جدیدیت میں اس کا بھی موقع نہیں بہر حال تلفظ کے بہتیرے مسائل ہیں جو آئندہ سفینہ کے صفحات میں پیش کئے جائینگے۔ فی الحال ایسے چند الفاظ کی نشاندہی کی جاتی ہے جن کا تلفظ مختلف طور پر اساتذہ اور علمائے ادب نے روا رکھا ہے اور وہ سب ہمارے لئے سند ہیں مثلاً

(۱) نَشَہ اور نَشّہ نشہ بروزن صبا (بدون تشدید) اور نشّہ بروزن صہبا (تشدید کے ساتھ) دونوں طرح مستعمل ہے اقبال نے دونوں تلفظ سے استعمال کیا ہے

(الف) نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے۔

اور

(ب) نشّہ سے کو تعلق نہیں پیمانے سے

اور شعرا نے بھی نشّہ کو تشدید کے ساتھ تلفظ کیا ہے۔

(۲) تَجَرَبہ اور تَجرُبہ دونوں طرح استعمال ہوا ہے دوسرا حرف متحرک یعنی بروزن فعولن۔ اور دوسرا حرف

ساکن بروزن فاعلن۔ مثلاً

(الف) برہنہ حرف نہ گفتن کمال دانا ہیست (اقبال)

(ب) سامنے ان کے ظفر برہنہ پا پھرتی ہے (حکمت)

(۳) **حرکت اور حرّکت** دوسرا حرف متحرک بروزن فَعَلُن یا دوسرا حرف ساکن بروزن فَعْلُن۔ مثلاً

(الف) صورت پذیر ہو کر حرکت بے خبر کی کیا (آتش)

(ب) ایکا یک ہوئی غیرت حق کو حرکت (حالی)

(۴) **پے ہم (پیہم) اور پیے ہم** دونوں طرح استعمال میں ہے پیہم بروزن ہمدم یا پیے ہم بروزن ہمہ دم مثلاً

(الف) پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع (مومن)

(ب) دال گئے پر جوشش آتا پیے ہم ہمکو (غالب)

(۵) **آئنہ اور آئینہ** یعنی آئنہ بروزن فاعلن اور آئینہ بروزن گنجینہ۔ آئینہ آئنہ ہے خود آئینہ ساز کا (شاد)

اس میں دونوں طرح کے تلفظ قلمبند ہوئے ہیں ۔

(۶) **کیفیت اور کیفیّت** پہلا لفظ بغیر تشدید کے دوسرا تشدید کے ساتھ یعنی کیفیّت بروزن خبریت اور کیفیت بروزن مفعولن تھا۔

(الف) کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں (اقبال)

(ب) کیفیتِ چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا (سودا)

(۷) نواب اور نوّاب ایک بغیر تشدید بر وزن کباب۔ دوسرا تشدید کے ساتھ بروزن الوّاب۔ مثلاً

(الف) نواب زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں (داغ)

(ب) آؤ ہم حضرت نوّاب سے بھی مل آئے (غالب)

(۸) نشتر اور نیشتر نشتر بروزن فعلن اور نیشتر بروزن فاعلن دونوں طرح مستعمل ہے۔ مثلاً

(الف) رستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا (غالب)

(ب) نیشتر زخم جگر پر نہ لگا نا ہرگز (مجروح)

(۹) مہمان اور میہمان مہمان بروزن فعلن اور میہمان بروزن فاعلن مثلاً مہمانِ دل ہے غم بھی دل میہمانِ غم (زکی)

دونوں تلفظ کی مثال ایک ہی مصرع میں۔

(۱۰) تیوری اور تیوری پہلا لفظ تیوری بروزن پوری فعلن دوسرا لفظ تیوری بروزن بے رنی (فاعلن) مثلاً:

(الف) تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں (انیس)

(ب) بے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے (غالب)

(۱۱) **بُرّش اور بُرش** بُرّش بروزن فعلن اور بُرش بغیر تشدید بروزن فعل ۔ دونوں طرح مستعمل ہے ۔ مثلاً

(الف) نہ آتا بُرّش تیغ جفا پر ناز فریاد (غالب)

(ب) شمشیر انبیا زجہاں را برش نماند (کلیم)

(۱۲) **کلْمہ اور کَلِمہ** لام ساکن کے ساتھ یا لام متحرک دونوں طرح جائز ہے ۔ مثلاً

(الف) کلمہ پڑھوا کے نہ انکھوں نو مسلمان نہیں (شاد)

(ب) کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی (اقبال)

(۱۳) **امید اور امّید** میم بغیر تشدید یا میم تشدید کے ساتھ مثلاً

(الف) اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانہ یاس (ذوق)

(ب) کوئی امیّد بر نہیں آتی (غالب)

(۱۴) **پیالہ اور پیالہ** پیالہ بروزن قبالہ (فعولن) اور پیالہ بروزن پالا (فعلن) دونوں طرح مستعمل ہے ۔ مثلاً

(الف) پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے (غالب)

(ب) خیر خم کی ترے ساقی مرا پیالہ بھر دے (؟)

ناسخ نے ایک ہی شعر میں دونوں تلفظ سے استعمال کیا ہے ؎

پیالہ مجھ آزادی کا بھر دے ساقی ، نہیں میرا پیالہ بہا جاتا ہے
(ناسخ)

(۱۵) گُہر اور گوہر ایک مد دن واؤ دوسرا ؤ کے ساتھ مثلاً
(الف) ہم اوجِ طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں } (غالب)
(ب) لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں }

(۱۶) قرآں اور قِران قرآن بر وزن قربان (مفعول)
اور دوسرا قِران بروزن کمان (فعول) مثلاً
(الف) پہن کر جامہ کبھی وہ آئے اگر قرآن کا (ذوق)
(ب) گر آوے شیخ پہن کے جامہ قرآن کا (میر)
(مگر اب دوسرا تلفظ غیر مستعمل ہے)

(۱۷) خِضر اور خَضر ایک میں ضاد ساکن دوسرے میں ضاد متحرک
(فتحہ) خِضر بروزن فکر (فعل) دوسرا خَضر بروزن بشر (فعل)
(الف) خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے (؟)
(ب) اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت (گمراہ در
ذرکافیہ) حالی۔

(۱۸) ندی اور ندّی ایک بغیر تشدید دوسرا تشدید کے ساتھ مثلاً

(الف) گودی میں کھیلتی ہیں اسکی ہزاروں ندیاں (اقبال)

(ب) چڑھی ہے یہ ترسی اتر جائے گی (رند)

(۱۹) بَرَہمن اور بَرْہمن بہ متحرک اور دوسرا ساکن مثلاً

(الف) مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو (غالب)

(ب) بَرْہمن وہ بَرَہمن میں ہے (ع.ک)

(۲۰) اٹّھا اور اٹھا تشدید اور غیر تشدید بھی :-

(الف) اٹّھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے (غالب)

(ب) جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے۔ (مومن)

(۲۴) خیال بروزن جمال ۔ خیال بروزن نال دونوں طرح مستعمل ہے :-

(۱) خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی (وحشت)

(۲) عشق ہمارے خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا (میر)

(۲۵) جبریل اور جبرئیل دونوں طرح مستعمل ہے۔

جبریل بروزن قندیل (مفعول) اور جبرئیل بروزن زنجبیل (فاعلات)

(۱) محمد بھی ترا جبریل بھی قرآں بھی تیرا
(۲) پانما یاں بام گردوں سے جبین جبرئیل } اقبال

دو آتشہ

(۴)

غالب

ہم بہ عالم ہم ز عالم برکنار افتادہ ام
چوں امامِ سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

عطا

گرچہ ہوں دنیا میں پر ہوں اہلِ دنیا سے الگ
کب امام آیا شمارِ دانۂ تسبیح میں

غالب

لن ترانی بجواب ارنی چند و چرا
مقتضائے ہمت بشناس و تو ہم آں بشنو

عطا

کیوں لن ترانی ہے ارنی کے جواب میں
ہمت کسی نہیں ہو رب بڑا تو ڈرا نہیں

غالب

سراغِ وحدتِ ذاتش تواں ز کثرت جست
کہ ساریست در اعداد بے شمار یکے

عطا

سمجھ کہ کثرتِ اشیا میں رازِ وحدت ہے
بہ غور دیکھ ہے اعدادِ بے شمار میں ایک

غالب

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

عطا

ہم کہاں راضی بھلا تھے شعر کہنے پر مگر
شعر کی خواہش ہوئی خود ہی کہ بنوں میرا فن

غالب

چہ گویم از دل و جانے کہ در بساطِ من است
ستم رسیدہ یکے ناامیدوار یکے

عطا

پوچھتے کیا ہو ہمدمو تم جان و دل کا حال
ایک ستم رسیدہ ہے ایک ہے ناامیدوار

غالب

کسی که دعوی هستی اساس وفاست
نشان دهد ز بناهای استوار یکی

گر دیم شرح ستمهای عزیزان غالب
رسم امید همانا ز جهان برخیزد

ذوق است هجر را به تماشا بگذرم ز رشک
خار است به پای عزیزان خلیده باد

مرا که باده ندارم ز روزگار چه حظ
ترا که هست و نیاشامی در بهار چه حظ

چنین که نخل بلند است و سنگ ناپیدا
ز میوه تا نه فتد خود ز شاخسار چه حظ

عطا

کہتے تو ہو کہ ہے سست وفا کی بنا بہت
یہ تو بتاؤ کس کی بنا استوار ہے

بیاں کرنے لگیں گر ہم ستمہائے عزیزاں کو
امید و آرزو کی رسم ہی دنیا سے اٹھ جائے

فغاں میں ہماری کا لطف ہے رشک ان (سے ملا ہوگا)
مزا حبیبہ ہے غیر عزیزوں کے بھی تلووں میں یا (چبھنے کا)

شراب پاس نہیں مجھکو رنگ گلشن سے کیا؟
تو رکھ کے پی نہ سکا تجھکو پھر بہار سے کیا؟

بلند شاخ ہے ہاتھوں میں سنگ بھی تو نہیں
ثمر جو خود ہی نہ ٹپکے تو شاخسار سے کیا؟

کلامِ گذشتہ شعرائے بہار

(۴)

جہاں تک ہو اُڑا دو دھجیاں دامانِ وحشت کی ؛ اسی دامن نے موتی کھو دیا ہے چشمِ گریاں کا

(صادق مثال عظیم آبادی)

نسرین، سبزہ، پتے زرد، گل ہو گئے انجمنِ ایراں ؛ نہ دیکھا جائے گا واللہ یہ جورِ خزاں ہم سے

(حسرت گیاوی)

مدد کرتی ہے تو اس وقت چارہ نہیں ہوتا ؛ زمانہ میں بھی کو اسے اجل مہرباں پایا

(فریاد عظیم آبادی)

عجیب بلا ہے محبت کہ اس محبت میں ؛ جو کچھ ہوا وہ غلط جو کہا گناہ کیا

(پیام عظیم آبادی)

دوست ہمکس ہو تو دل ہو شاد کیا ؛ مرگِ دشمن کی مبارکباد کیا

عبد الرؤف فکر صادق پوری (پٹنہ)

نہیں یہ داغ سے جلتا ہے دلِ جگر اپنا ؛ چراغ لے کے دکھاتے ہیں ہم کو گھر اپنا

رضا عظیم آبادی

شررِ عشق نے وہ آگ لگائی دل میں ؛ گھر جلا سلسلۂ اور ہم سے بجھایا نہ گیا

(رجوز عظیم آبادی)

ہم اپنے دورِ حیات کا رخ بدل دے ہیں تو جرم کیا ہے

یہ اپنی تنظیم زندگی ہے نظامِ شمس و قمر نہیں ہے

(زارؔ عظیم آبادی) ــــــــــ

اس گل کے سوا گلشنِ دنیا میں نہیں کچھ ؛ دیکھوں کسے دکھلائی بھی دیتا ہے کہیں کچھ

(سجاد دانا پوری) ــــــــــ

کفن کی فکر کیا ہم وحشیوں کے واسطے اکبر ؛ کبھی چل جائیں گے اوڑھ کر دامن بیاباں کا

(اکبر دانا پوری) ــــــــــ

جس کو ہستی میں خیالِ عدم آباد نہ ہو ؛ وہ مسافر ہے سفر میں جسے گھر یاد نہ ہو

(شفق عماد پوری) ــــــــــ

دامن کبھی جھلتے ہی ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ ؛ اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

[شوق نیموی] ــــــــــ

ایک دن وہ تھا کہ گلشن ہو بسر ہوتی تھی ؛ آج دو پھول کو محتاج ہے تربت میری

[منصور گیاوی] ــــــــــ

مرنا اس جان کہ جینے رہنا ؛ راسخ کہو کیا قرار پایا

[راسخ عظیم آبادی] ــــــــــ

یہ لڑکے زمانے تن میں یہ پی کے خمار ابھی سے شوخیاں کرتا ہے طفلِ دل پالے

[حجر کاکوی] ــــــــــ

کم بخت چشمِ شوق وہ انداز لگا گر نہ ہو ؛ یوں آنکھ میں رہا ہوں کہ حیا کو خبر نہ ہو

[illegible]

معیار و میزان (تبصرہ)

(۱) **کوہکن کا مغنی** ڈیمائی سائز کے ۱۴۰ صفحات کو محیط یہ ایک صاف ستھری کتابت و طباعت کا دلکش مرقع موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا ہے اس کے مرتب جناب پرویز باغی نے بڑے سلیقے سے کوہکن کے ایک مغنی آتش نفس، "بدیع الزماں خاور کی شخصیت"، اہمیت شاعرانہ عظمت اور مفکرانہ بصیرت کا ایک ایسا آئینہ پیش کیا ہے جس میں خاور کی صورت و سیرت کے خط و خال بوجوہ احسن نظر آتے ہیں۔ جناب خاور کی شہرت خاور سے باختر تک پھیلی ہوئی ہے۔ ادبی حلقوں میں ان کا پُر وقار کلام، ان کے تراجم بہت مقبول رہے ہیں۔ اردو دنیا کے ان گنت ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے ان کے محاسن ادبی اور سخنورانہ نکتہ سنجی کی دل کھول کر داد دی ہے جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں۔ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں مختلف رسالوں اور کتابوں میں پھیلی ہوئی تھیں جن کو فاضل مرتب نے بڑے حسن سلیقہ سے مرتب کر کے ادبی حلقوں سے روشناس کیا ہے۔ یکجائی طور پر خاور کو سمجھنے اور ان کی تخلیقات کا بھرپور۔

مطالعہ کرنے کے لئے یہ ادبی تحفہ ہر طرح ستائش کے قابل ہے۔ جن ادیبوں کی تنقیدی رایوں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں وہ نہ محض ستائشی اور رسمی ہیں بلکہ ان لوگوں نے پوری دیدہ وری اور نکتہ سنجی سے کام لے کر خاور کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کوئی معمولی نہیں۔ تقریباً پچاس دانشوروں نے سنجیدگی کے ساتھ خاور کو روشناس کیا ہے اور ان کی تخلیقات کو پرکھا ہے۔

مرتب نے یہ ایسا بڑا مستحسن اقدام کیا ہے کہ ایک ادیب و شاعر کے مطالعہ کا بیک نظر موقع فراہم کیا ہے جچی تلی رایوں کے اقتباسات کو بڑی یک دستی اور محنت سے مرتب کر کے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ اقدام قابل تقلید ہوگا۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ حسین پیکر لباس حریر میں جلوہ گر ہے اور اسکی قیمت تیس روپے گراں نہیں بلکہ ارزاں ہے۔

آئندہ شمارہ میں مندرجہ ذیل کتابوں اور رسالوں پر تبصرے۔

(۱) مرتبہ شہاب کرچی۔ (۲) موتی پھول ستارے (بدیع الزماں خاور)

(۳) روحِ ادب (مغربی بنگال اردو اکادمی)

سفینۂ ادب کا ترجمان

دو ماہی

سفینہ

شمارہ (۱۳)

ستمبر ——— اکتوبر

۱۹۸۴ء

فہرست

مدیر

عطا کاکوی

قیمت ۳ روپے

Rs 3/=

ملنے کا پتہ: کل تحریک ہاؤس سبزی باغ پٹنہ ۴ مطبوعہ دی کاکو سٹار پریس پٹنہ ۶

معروضات

ڈاکٹر ہادی حسن (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) کے ایک بھائی جعفر حسن نام تھے۔ ان کی تجویز تھی کہ اردو املا کو آسان سے آسان تر کر دیا جائے اور وہ خود اس پر عامل بھی تھے۔ اپنا نام وہ "اجافر ہسن" لکھتے تھے اور اسی طرح مضامین میں بھی اسی املا کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ سفینہ ع ۱۲ میں املا کی بعض ایسی ہی صورتیں آپ کو نظر آئی ہوں گی مثلاً تعلیقات کو تالیقات اور رجوع کو رجو۔ یعنی کی کتابت میں یوں تو غلطیاں کچھ ناگزیر بھی ہیں۔ کچھ نقطوں کی بے احتیاطی سے الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ کاتب کی کم سوادی بھی اس پر مزید گل فشانی کرتی ہے۔ مگر ساری غلطیوں کو کاتب کے سر تھوپنا بھی مناسب نہیں۔ خود مرتب یا مدیر کی نکاسلی اور بے التفاتی بھی اس جرم میں شریک غالب ہے۔

---

* اس بات کا تو گمان نہیں کہ سفینہ میں جو کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں ان کو آپ مدیر کی "نادانی" پر محمول کریں گے۔ البتہ اس بات کا خدشہ ضرور ہے کہ بعض قارئین کہیں ان کو مدیر پر اعتماد ناقص رکھنے والے مستند نہ سمجھنے لگیں یا یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ مدیر سفینہ خدانخواستہ

"جافرسن" کا مقلد بن گیا ہے۔ اللہ کے معاملے میں مدیر سفینہ اتنا جلدت پسند یا بدیدیت کا شکار نہیں ہوا ہے۔

وفیات لکھنے کا حق یا تو علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم کو تھا یا پھر مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم کو کتنوں کی تمنا تھی کہ ان دونوں کے جیتے جی وفات پا کر وفیات کے مستحق ہو جاتے۔ وفیات مرنے والوں کی زندگی کا تاثراتی خاکہ ہوتا ہے جس سے اسکی جیتی جاگتی تصویر ابھرتی ہے اور زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

آٹھ نو ماہ اُدھر کی بات ہے کہ بہار کے دو عظیم المرتبت ادیب آگے پیچھے دنیا سے رخصت ہو گئے ایک تنقید کے مرد افگن کلیم الدین احمد دوسرے تحقیق کے مرد میدان قاضی عبدالودود۔ وفیات کے سلسلہ میں معارف نے ان دونوں کے واقعہ ارتحال پر روشنی ڈالی ہے۔ وفیات کے مندرجات صحیح ہونے چاہئیں تاکہ آئندہ سند نہ پکڑ لیں۔ چند مسامحات کی نشاندہی ضروری سمجھی گئی۔

۔ کلیم الدین احمد کے متعلق معارف فروری ۸۴ء کے مسامحات ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) "کلیم الدین احمد ۱۹۰۸ء میں پٹنہ کے ایک علمی اور دینی گھرانے میں

پیدا ہوئے "

پیدا تو وہ ۱۹۰۸ء ہی میں ہوئے مگر گورنمنٹ اور تعلیمی محکمے میں ان کی پیدائش کا سال ۱۹۰۹ء مندرج ہے۔ جس خاندان میں وہ پیدا ہوئے اس کا ماحول علمی تو یقیناً تھا مگر دینی ماحول رخصت ہو چکا تھا۔ خود کلیم کی خود نوشت "اپنی تلاش میں" اسکی شاہد ہے۔

(۲) "وہ ان (کلیم الدین احمد) کے پرنانا حکیم عبدالحمید پریشان ... تھے"

پرنانا اصطلاح میں نانا کے باپ کو کہا جاتا ہے۔ کلیم الدین احمد کے نانا کون تھے؟

کوئی نہیں جانتا تو نانا کے باپ کو کون بتا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریشان ڈاکٹر عظیم الدین کے نانا تھے اس رشتے سے وہ کلیم کے پردادا ہو سکتے ہیں،

(۳) "وہ اپنے والد ڈاکٹر عظیم الدین کے کلام کو جمع کر کے ایک مجموعہ "نغمۂ گل" کے نام سے شایع کیا"

نغمۂ گل نہ کسی کتاب کا نام ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کا نام گل نغمہ ہے جو غالب کے ایک شعر کا ٹکڑا ہے۔ کلیم الدین اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اسکی ایک جلد انہوں نے فراق کو دی تھی۔ فراق نے اپنے کلام کا نام بھی یہی رکھ لیا۔ اسکو سرقہ سمجھئے۔

(۴) "وہ اقبال کی اعلیٰ درجے کی نظمیں بھی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت

نہیں رکھتی،،

ایسا نہیں ہے کہ کلیم الدین اقبال کی شاعری کے معترف نہ ہوں۔ ان کے ساقی نامہ" کی بے حد تعریف کی ہے۔ وہ اقبال کو بڑا شاعر سمجھتے تھے مگر ان کو اس پر اصرار تھا کہ وہ اور بڑے شاعر ہوتے اگر شاعری کو پیمبری سے علاحدہ رکھتے۔

(۵) کلیم الدین احمد کو جو سرکاری خطاب "پدم شری" اور دیگر انعامات اعزاز اور ڈگریاں ملتے گئے ان کا ذکر بھی وفیات میں ہونا چاہیئے تھا۔

اسی ماہ کے معارف میں قاضی عبدالودود پر بھی وفیات کے سلسلہ میں ذکر ہے۔ اس مضمون میں بھی چند مسامحات ہیں مثلاً :—

(۱) "قاضی عبدالودود کے والد قاضی عبدالوحید عالم دین تھے مگر ان میں تبدیلی آئی اور عقائد میں بریلوی ہو گئے"

عالم دین سے مراد اگر باضابطہ دینی تعلیم کی تکمیل مقصود ہے تو، قاضی عبدالوحید نہ مولوی تھے" نہ عالم نہ فاضل۔ انہوں نے ایف اے تک انگریزی تعلیم حاصل کی تھی مگر پھر انگریزی سے ایسی نفرت ہوئی کہ سب کچھ بھلا بیٹھے اور خدمت دین میں لگ گئے۔ بریلوی عقاید کیا ہیں" معلوم نہیں۔ کیا بریلوی عقائد والے عالم دین نہیں کہے جا سکتے؟

وہ خود تو نہیں بلکہ ان کی اہلیہ البتہ مولانا احمد رضا خاں صاحب سے
بیعت تھیں۔ قاضی عبدالوحید ندوہ کے سخت مخالف تھے اور اسکے خلاف "
جلسہ دہ" قائم کیا تھا۔

(۲) اپنے عقائد وخیالات کے لئے ایک ماہانہ رسالہ "تحفہ ملکا درقا"
رسالے کا نام تحفہ نہیں بلکہ تحفۂ حنفیہ تھا۔

(۳) "قاضی عبدالوحید پٹنہ کے اندر پیدا ہوئے"۔
وہ پٹنہ کے اندر نہیں بلکہ باہر پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش نانیہال
میں موضع کاکو ضلع گیا میں ہوئی۔

(۴) "حکومت ہند نے پدم شری سے نوازا"۔
جو لوگ قاضی صاحب کے مزاج سے واقف ہیں وہ میری رائے
کی تائید کریں گے کہ وہ اس خطاب کو اگر ملتا بھی تو قبول نہ کرتے۔ بہ غیر
ازیں خطاب ان کو سرے سے ملا ہی نہیں۔

گزشتہ شمارے میں مظفر حسین مرحوم عظیم آبادی کی داستان پر
معروضات میں جو اظہار دلم کیا گیا تھا اس سلسلے میں ان کی تین کتابوں
کا ذکر تھا۔ یعنی نکات، ادب، فنون لطیفہ، درجمالیات اور میرا موقف
ان کی ایک کتاب ادراک بھی ہے جس کا نام اورنگ ادب ہے جو اپنے
رنگ میں انفرادیت کی مثال ہے) اور مصنف کی ژرف نگاہی، علمی

بصیرت اور فکری بلندی کی آپ اپنی نظیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چاروں کتابیں اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ ہیں۔ یہ بھی ایک دل خوش کن اطلاع ملی کہ ان کی شعری تخلیقات کا مجموعہ بھی مرتب ہو رہا ہے اور جلد اشاعت پذیر ہوگا۔ وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے۔ میں نے نجی محفلوں میں ان کی نظمیں سنی ہیں۔ نہ وہ غزل کے دلدادہ تھے اور نہ وہ اپنی شاعری کے علم بردار۔ ان کی شاعری میں بھی فکری عناصر کار فرما ہیں۔ کلام کی اشاعت کے بعد قارئین خود ان کے فکر و نظر کا اندازہ لگا سکیں گے۔

ابھی ایک ادیب کی موت کو رو رہے تھے کہ عظیم آباد کا ایک خوش گو شاعر بھی اس دنیائے آب و گل سے چلا گیا۔ عظیم آباد جو کبھی صحیح معنوں میں شعر و شاعری کا گہوارہ تھا آہستہ آہستہ خالی ہوتا جا رہا ہے۔ ناجد شمیم عظیم آبادی ایک خوش فکر خوش اخلاق اور خوش مزاج شاعر تھے۔ بہار کی خبریں ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ ابھی حال ہی میں وہ گورنمنٹ کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے تھے کچھ دن بیمار رہے۔ وہ کاظم حسین آزاد کے تلامذہ میں تھے اور جمیل مظہری سے بھی فیض یاب تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

یہاں وہاں سے

(۴)

(۳۷) جسم کی آواز

امریکہ کے سعیانتے ایک ماہر کی جدید تحقیق ہے کہ انسان کے گرد وپیش آوازیں بلند ہوتی ہیں وہ ان کی کھالوں پر بالکل اسی طرح نقش ہو جاتی ہیں جس طرح ریکارڈ پر آواز مرتسم ہو جاتی ہے۔ اس محقق کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ مخصوص آلات کے ذریعہ کھال پر منقوش لہروں کو پھر سنا جا سکتا ہے جس طرح ہم گراموفون ریکارڈ سنتے ہیں۔

یہ خیال پہلے ایک شاعرانہ بصیرت سمجھا جاتا تھا۔ شاد عظیم آبادی کا شعر ہے ؎

اعضا گواہی دینگے تو میں بھی کہوں گا یوں
یارب یہ سب شریک تھے میرے گناہ میں

اب سائنس نے ثابت کر دیا۔ کم عقلوں کا خیال ہے کہ سائنس مذہب کو کمزور کر رہا ہے حالانکہ ان کا یہ خیال خود ہی کمزور ہے۔ وہی مذہب سائنس کی زد میں آکر کمزور ہو جاتا ہے جس کی بنیاد توہم پرستی پر ہے جو مذہب

عین فطرت ہے اور حقائق پر مبنی ہے سائنس اسکو تقویت پہنچاتا ہے۔

(ابو رسالہ اگست ۱۸۴ء)

(۳۸) غالب کے اساتذہ؟ غالب پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہیگا۔ ان کی شخصیت تہہ در تہہ ہے۔

غالب نے اپنے کسی استاد کا نام نہیں بتایا۔ اور بتایا بھی تو عبدالصمد کا۔ اور وہ بھی مصلحتاً جو خود ان ہی کے بیان سے وہمی ثابت ہوا۔ اگر اس وجود خارجی ہو بھی تو وہ ان کا درسی استاد ہوگا شاعری کا نہیں جس نے ایک مختصر مدت میں غالب کو فارسی زبان کے اسرار و رموز کو گھول کر پلا دیا۔ رہے میاں معظم وہ بھی ابتدائی درسی کتابیں پڑھائی ہونگی۔ بابعض نے شیفتہ کے علی الرغم اتفاقاً غالب کو نظیر کا شاگرد بنا دیا۔ نظیر ملائے مکتبی تھے۔ محلے کے لونڈوں کو نیم کے درخت کے نیچے پڑھاتے تھے۔ غالب ان کیہاں کہاں زانوئے ادب تہہ کرتے۔ بعض لوگوں نے میر کو استاد غالب سمجھا کہ دونوں اکبرآباد کے تھے مگر ان کو معلوم نہیں کہ جب میر آگرہ گیا دہلی کو بھی خیر باد کہہ چکے تھے تو غالب کتم عدم میں تھے۔ میر کے لکھنؤ جانے کے سولہ سال بعد غالب اس عالم آب و گل میں آتے ہیں۔ کیسی استادی اور کیسی شاگردی؟ غالب کا اپنی شادی سے پہلے ہی دہلی میں آنا جانا تھا

۱۴ سال کی عمر میں ان کی شادی معروف کی بیٹی سے ہو گئی۔ اسکے تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ مستقلاً دہلی باشی ہو گئے۔ وہاں شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔ شاہ نصیر جگت استاد تھے۔ وہ نہ صرف مومنؔ و ذوقؔ کے بلکہ معروفؔ کے بھی استاد تھے۔ معروف نے اپنے داماد غالبؔ کو بھی شاہ نصیر کی طرف رجوع کرایا ہوگا۔ کسی نے جانا کسی نے نہ جانا۔ مگر گھر کا ایک بھیدی حافظ غلام رسول شوقؔ جو خود بھی نصیرؔ کا شاگرد تھا اس سے بات کب چھپی رہتی۔ اس کا ایک قطعہ سُنئے جس سے غالب کی شاگردی نصیرؔ ثابت ہوتی ہے ؎

مومنؔ د آزردہ، غالبؔ، ذوقؔ و شوقؔ
شاعری کے فن میں کامل ایک ہیں
فیض سے جن کے بھرے ہیں فیض یاب
وہ نصیرؔ استاد کامل ایک ہیں۔

(۳۹) **اقبال کے غیر مطبوعہ اشعار** | پنڈت کنور نرائن رینہ اقبال کے شاگرد تھے اور پھر دونوں ۱۹۰۵ میں لندن میں بیرسٹری سا تھ پڑھ رہے تھے۔ رینہ نے اپنے ایک دوست کو لندن سے ایک خط لکھا اور اس میں اپنے استاد کے چند اشعار

لکھ کر بھیجے جو ان کے کلام میں شایع نہ ہوئے۔ وہ اشعار یہ ہیں :-

عجیب چیز ہے یہ بادۂ محبت بھی ۔ ہزار تلخ ہو پر بے مزا نہیں ہوتا
ہزاروں دوست ہیں پھر اضطراب سے رہتا ہوں ۔ جہاں میں جب کوئی آشنا نہیں ہوتا
عجیب چیز ہے مغرب کی زندگی جس سے ۔ دماغ ہوتا ہے، دل آشنا نہیں ہوتا
نماز پڑھتا ہوں اور بے نماز رہتا اقبال ۔ یہ فرض وہ ہے جو مجھ سے ادا نہیں ہوتا

اقبال کا ایک شعر اور بھی ہے۔ ایک دوست کیونا نے اپنے کسی دوست کو لکھ بھیجا تھا جو غیر مطبوعہ ہے :-

ملے گا کیا تجھکو اے ستمگر ہمارے دل کا خیال وہ کرکے
ہمیں خلش ہوگی آرزو کی کہیں تمنا کا خار ہوگا

(تعمیر ہریانہ - مئی جون ۸۲ء)

(۴) **صفیر اور آتش** | صفیر بلگرامی نے آتش کی تاریخ وفات کا ایک قطعہ لکھا ہے۔ آتش کا انتقال ۱۲۶۳ھ میں ہوا اس وقت صفیر کی عمر ۱۱، ۱۲ سال کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ صفیر اتنی کم عمر تھا لیکن اس درجہ باکمال ہو گئے تھے کہ فن تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل کر لیا تھا اور وہ بھی فارسی میں تھا۔ ان صفیر سے یہ بات غیر متوقع نہیں کہ اس کو صفیر کا صرف اعجاز سمجھیں۔ انہوں نے اپنی ولادت کی تاریخ خود کہی ہے۔ اس سے آپ کیا نتیجہ نکال سکیں گے۔ صفیر نے آتش کا قطعہ تاریخ وفات

لت بعد میں کہا ہوگا اس سے غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے ۔

(۴) **جگر اور اصغر** جگر کی مے نوشی اور عیش کوشی تو سب پر ظاہر تھی ۔ ان کا ظاہر و

طن دونوں یکساں تھا۔ مگر ان کے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز اصغر
ونڈوی کے تبسم پر اتنا دبیز لبادہ تقدس و اتقاد پڑا ہوا ہے کہ اندر
جانکنا مشکل ہے ۔ اصغر اپنے ابتدائے عہد جوانی میں جب ڈیلو سے
یں ملازم تھے خوب جھوٹ کر داد عیش دے چکے ہیں دخت رز سے
ی سکا و تھا اور زنان بازاری سے بھی ۔ آخر ایک کم خرچ بالا نشیں
د گھر لا کر بیگم بھی بنا لیا ۔ ان کی ایک سالی بھی تھی ۔ جوانی پر آئی ہوئی
ی نہیں بیٹھ سکتی تھی آخر اسکو جگر سے وابستہ کر دیا۔ جگر اس رشتہ ازدواج میں کب
بندھے رہتے ۔ وہ ٹھہرے آزاد مشرب، آخر کشیدگی بڑھی اور انفرادی نہیں و
بنک لا اصغر کو بڑی پشیمانی تھی کہ وہی اس کے ذمہ دار تھے ۔ انھوں نے چاہا کہ
ال کے زخم و غم کا مداوا ہو ۔ کون کرتا ۔ وہ خود ہی آمادہ ہوے مگر شریعت
چشم نمائی کی ، جمع الاختین سد راہ تھا بیگم اصغر بھانپ گئیں اور بجذبہ ایسار
پنے کو انھوں نے بیچ سے اٹھالیا اصغر آزاد ہو گئے ۔ اب بیگم نے اپنا جذبہ اطیار
د دکھلا گیا گر جذبہ خوانی کے تقاضے نے مجبور کیا ۔ دست گیر کون ہوتا ۔ پھر
ر کام آئے ۔ اب وہ بیگم اصغر سے بیگم جگر ہو گئیں دونوں بہر حال ہم زلف پہلے
لے جو بڑے تھے وہ چھوٹے ہو گئے اور جو چھوٹے تھے ۔

وہ بڑے بن گئے۔ سیاست میں ۔ ڈل بدل تو سنا تھا۔ دستار
بدل سے بھی کان آشنا ہیں مگر بیوی بدلنے سے بھی دنیا خالی نہیں ہے۔

(۴۲) شاعر شاگرد بیدل کی موت

بندرابن داس خوشگو بیدل سے بہت قریب
تھا وہ ان کا بڑا معتقد بیدل کا ایک شاگرد معنی یاب المخاطب بہ شاعر ان کا
بڑا چہیتا تھا۔ بیدل کی وفات کے بعد وہی ان کے سالانہ عرس مشاعرے
کا انتظام کیا کرتا تھا۔ بیدل صوفی شاعر تھے ان کے کشف و کرامت کے
بھی لوگ قائل تھے۔ امرائے دولت ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے
یہاں بڑے ذوق و شوق سے جاتے۔ بیدل ان کو خاص طور سے حلوا تیار
کرا کر کھلاتے جس کا مقویات کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا سو ان مقویات
کا نام انہوں نے ادویہ موجود رکھا تھا۔ بیدل کی چار بیویاں تھیں اس
لحاظ سے ان کو زوجی بیگ کہا جا سکتا ہے۔ بیدل کے بعد ان کے [illegible]
ان میں شاگرد شاعران مجبولوں کو رنگیوں کے ہاتھ پیچنے پر مطعون بھی تھے،
خوشگو نے اپنے تذکرہ 'سفینہ' میں شاعر کی موت کی اطلاع دی ہے کہ،
وظیفہ از دواجی ادا کرتے ہوئے واقع ہوئی نفس واقعہ سے بحث نہیں،
مگر خلوت کی بات جلوت میں کیسے مشہور ہو گئی۔ مرنے والا مر گیا وہ تو
کہنے سے رہا۔ فریق ثانی کتنی ہی بے حیا اور بے باک ہو یہ راز کی بات

زبان پر لا ہی نہیں سکتی تھی۔ خوشگو کو اطلاع کیسے ہوئی؟

(۴۳) میر حسن کی ایک نئی تصنیف

یہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے
کہ کسی مصنف یا شاعر کی کوئی تخلیق اپنی شاہکار حیثیت اختیار کر لیتی
ہے تو اس کی دیگر تخلیقات پس پشت پڑ جاتی ہیں۔ میر حسن کی مثنوی
نے انھیں شہرت حاصل کی کہ وہ صرف ایک مثنوی نگار ہی کی حیثیت
سے روشناس ہوئے حالانکہ ان کی غزلیات اس قابل ہیں کہ اس
دور کے بہترین غزل گویوں کی صف میں میر حسن کو جگہ دلا سکتی ہیں۔
میر حسن بہ حیثیت مرثیہ گو نہ مشہور ہوئے نہ مقبول ہوئے۔ مگر انھوں
نے مرثیے بھی لکھے اور نوحے بھی۔ حال ہی میں ان کی ایک نادر تخلیق "دہ
مجلس" کا سراغ ملا۔ محرم کی مجلسوں میں نوحہ خوانی اور ذکر مصائب اہل
کربلا سنانے کا قدیم رواج تھا۔ یہ دہ مجلس اردو نثر کی ایک اہم تاریخی
دستاویز ہے۔ نوحے تو خیر میر حسن کے ہیں جن میں ان کا تخلص موجود
ہے۔ پھر بھی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ پوری کتاب میر حسن کی ترتیب
کردہ ہے یا کسی اور کی مرتب کردہ ہے چونکہ یہ مخطوطہ ناقص الاول و آخر
ہے اس لئے کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی۔ بہرحال یہ مخطوطہ قابل
توجہ ہے۔ چونکہ یہ دہ مجلس اردو نثر میں ہے اس لئے اگر واقعی میر حسن کی ہے
تو قدیم اردو نثر کا نمونہ ہے اور قابل قدر ہے۔ میرا شبہ یہ ہے کہ اس کا

مرتب کوئی اور ہے۔ نوحہ میں اگرچہ تخلص حسن ہے مگر اس میں الفاظ کی ایسی فاحش غلطیاں ہیں جو میر حسن جیسے شاعر سے غیر متوقع ہیں (ماہ اگست ۸۴ء)

(۴۴) **غالب کا بھانجا** اکبر بیگ غالب کے حقیقی بہنوئی شفیع حسن کے چھوٹے بھائی مرزا افضل بیگ تھے

انکا انتقال ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ افضل بیگ کی شادی مومن کی بھانجی سے ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک بنگالن کو بھی رکھ لیا تھا جس کا ان کے انتقال کے بعد ان کے بھتیجے عباس بیگ نے اغوا کر لیا تھا۔ یہ عباس بیگ غالب کے بھانجے تھے۔

افضل بیگ کے بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا اور عرف میرزا دولہ تھا۔ ان کا مکان محلہ چوڑی والان کی گلی میں تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ غالب کے والد کا بھی نام عبداللہ تھا اور عرف مرزا دولہ تھا۔

(۴۵) آثار کاکو حضرت مولانا ماجد بدر شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی کی غیر مطبوعہ تالیف ہے اس میں یہ اطلاع ملتی ہے کہ کاکو میں مولوی یوسف حسین مرحوم (پروفیسر محسن و پروفیسر حسنین کے نانا) نے آج سے قریب سو سال پہلے ایک مطبع قائم کیا تھا اور اس کتابوں کے علاوہ ایک اخبار بنام "گل البحر" بھی شائع ہوتا تھا۔ ایک دیہات سے اخبار کا اجرا عجیب انگیز بھی ہے اور قابل تعریف بھی۔ آئندہ شمارہ میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

دو آتشہ

(۷)

غالب

شب فراق ندارد سحر ولی یک چند
بہ گفتگوی سحر می توان فریفت مرا

عطا

شب فراق کی ہوتی نہیں سحر لیکن
فریب دینے کو مجھ کو سحر کی بات کرو

غالب

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است اما
ز ننگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

عطا

مرا دل بھی تقویٰ پہ مائل ہے لیکن
فقط ننگ زاہد سے کافر بنا ہوں

غالب

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب
جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

عطا

طلب جو عرفی کی ہے تو کلام غالب دیکھ
کہاں ہے اور کسی جام میں مئے شیراز

غالب

غالب مذاق ما نتواں یافتن ز ما
ہم شیوۂ نظیری و طرز حزیں شناس

عطا

وہی مذاق سخن کو بھی میرے سمجھے گا
نظیری اور حزیں کے طرز کو سمجھے

غالب

شعر غالب نبود وحی و نگوییم ولی
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامی نیست

عطا

غالب کا شعر وحی نہیں مانتا ہوں میں
مگر تم اس کے بھی ہو کہ الہام بھی نہیں

غالب	عطا
اگر خواہی کہ بینی چشمۂ حیوان بہ تاریکی	اگر تاریکی میں تم چشمۂ حیوان دیکھا چاہو
سواد نظم و نثر غالب معجز بیاں بینی	تو آؤ نظم و نثر غالب معجز بیاں دیکھو
اندریں شیوۂ گفتار کہ داری غالب	ہے جو شیوۂ گفتار تمہارا غالب
اگر ترقی نہ کنم شیخ حزیں را مانی	سچ اگر پوچھو تو ہے شیخ حزیں کی مانند
دل خستہ ایم و بود مے و ملہم	غم کے ماروں کیلئے مے ہے علاج
یا فرقہاں حدیث حلال و حرام چیست	کیا حلال ان کے لئے اور کیا حرام
پہلو شگافید و ببینید دلم را	دیکھ لو دل کو مرے چیر کے سینہ میرا
تا چند بگویم کہ چساں است و چساں نیست	تم کو تا چند بتاؤں کہ ہے حالت کیسی
نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب	جہاں سے مجھکو امید وفا نہیں ہے مگر
ببیں کہ پرسد و گوید ست نیرنگ است	ابھی میں خوش ہوں کوئی کہہ دے وجود وفا کا
مرا بہ غیر بہ یک جنس دو شمار آورد	غیر کو اور مجھے آپ نے یکساں سمجھا
فغاں کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگس	مٹ گیا دہر سے فرق مگس و پروانہ

مدیر

مطالعہ کتب

مستقبل کا رشتہ ماضی سے ناگزیر ہے۔ ہر مستقبل کو آج نہیں تو کل ماضی بننا ہے۔ بھولی بسری بات کی بنیاد پر ہم بڑی سے بڑی عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔ ماضی کو بھلا دینا گویا اپنے مستقبل سے روگردانی ہے۔

ہمارا ادبی سرمایہ بظاہر آج حقیر ہی کیوں نہ نظر آئے مگر اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے، کہ ہمارا آج کا ادب اسی بنیاد پر قائم ہے ـــــ اردو کی قدیم کتابیں جو آج سے سو سال یا اس سے بھی قبل کی مطبوعات ہیں وہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ اب وہ یک گونہ مخطوطات کی شکل میں داخل ہو چکی ہیں۔ آج کل کے قارئین بالعموم ان سے ناآشنا ہیں۔ ایسی ہی قدیم مطبوعات کی طرف ایک نظر ڈالنا عنوان بالا کا مقصد ہے۔ سہ ماہی رسالہ "معاصر" پٹنہ میں کئی سال پہلے یہ سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔

(۱) دیوان تجمل (۲) وسیلۂ ظفر (۳) عقد ثریا (۴) فرمائش احباب (۵) معلم الشعرا (۶) تعزیت نامہ (۷) نوطرز مرصع (۸) نگارستان الفت (۹) مثنوی چہار درویش

اب پھر یہ سلسلہ سفینہ کے اوراق پر جاری کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیں گے۔ " مدیرہ"

(۱۰)

منتخبات صبغت عظیم آبادی

عظیم آباد بھی دلی اور لکھنؤ کی طرح اردو کا مرکز رہا ہے۔ ہر دور میں شعراء اور ادباء کی بڑی تعداد عظیم آباد اور اس کے اطراف میں پائی جاتی تھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ کوئی ایسا تذکرہ مرتب نہ ہو سکا جس سے ان لوگوں کی ادبی خدمات کا پورے طور پر پتا چلتا۔

حکیم صبغت اللہ صبغت بھی انہیں چند نفوس میں سے تھے جنہوں نے عظیم آباد کے لباط سخن پر داد سخنوری دی ہے۔ ان کے حالات نہیں ملتے۔ تاریخ شعرائے اردو مصنفہ

عزیزالدین بلخی میں بھی کوئی اطلاع نہیں ملتی ہے۔

ان کا ایک مختصر دیوانچہ بعنوان "منتخبات صبغت" مسمیٰ بہ "صبح قیامت" احسن المطابع پٹنہ ۱۳۰۳ھ م ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل ۲۰ صفحات ہیں اور کل غزلوں کی تعداد ۱۵ ہے مگر یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر حرف تہجی میں کم از کم ایک غزل بھی ضرور ہو۔

سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے جس سے مختصر ہی سہی بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ دریں ایام از تصنیف منیف شاعر بے عدیل فلاطون دوراں جناب حکیم محمد صبغت اللہ صاحب متخلص بہ بہ صبغت خوشہ چین خرمن سخن حضرت جناب نادر شاہ خان صاحب شوق مدظلہ شاگرد رشید حضرت غالب علیہ الرحمۃ۔

منتخبات صبغت

مسمیٰ

صبح قیامت

حسب فرمائش جناب عبدالرحیم صاحب تسنیم و جناب عبدالرحمن خان صاحب قدرت عظیم آبادی بہ سعی جناب منشی عابد حسین صاحب

منصرم مطبع و مہتمم "نالہ عشاق" پٹنہ۔ در احسن المطابع
محمد عبد القادر طبع شد۔

عبارت بالا سے چند مفید باتیں مستنبط ہوتی ہیں۔

(۱) صبغت جناب شوقی شاگرد غالب کے شاگرد تھے۔ جو طبع دیوان
کے وقت تک زندہ تھے۔

(۲) یہ دیوان پٹنہ ہی کے ایک مطبع میں طبع ہوا جس کا نام احسن المطابع تھا۔

(۳) اس مطبع کے منصرم عابد حسین عابد تھے جو خود بھی شاعر تھے
اور اسی مطبع سے "نالہ عشاق" گلدستہ کلام شعرا شائع ہوتا تھا۔

(۴) جن دو حضرات کی فرمائش سے یہ دیوان طبع ہوا وہ دونوں بھی
شاعر تھے جن کا تخلص اثیم اور قدرت تھا۔

افسوس ہے کہ ان شعرا کے نہ کلام ہی دستیاب ہوتے
ہیں اور نہ حالات ہی۔

صبغت نے اپنے ایک مقطع میں شوقی کی شاگردی کا
یوں اعتراف کیا ہے ۔
صبغت بتاؤں تازہ روئے سخن اسے
بخشے جو رنگ صحبت شوقی اثر مجھے

اس مختصر دیوان میں جو غزلیں ہیں وہ زیادہ تر لکھنوی
طرز انشا سے مملو ہیں۔ خیالات فرسودہ، روایتی اور جذبات دلی

سے عاری ہیں۔ جو غزلیں آتشؔ اور غالبؔ کی زمینوں میں بھی لکھی ہیں وہ بھی بے کیف مضامین سے مملو ہیں۔ مثلاً غالب کی زمین میں ایک غزل ہے ؎

عذر ہے قلت فرصت کا سحر ہونے تک۔ ٹھہرئے اور ذرا درد جگر ہونے تک

اس زمین کی ردیف غالب ہی کے تتبع میں ہونے تک (بجائے ہونے تک) ہے۔

آتشؔ اور غالبؔ وغیرہ کی زمین میں ایک غزل ہے ؎

خوگر ظلم کوئی جب نہ ملا میرے بعد

ہو گئے بے چین بہت قلب جفا میرے بعد

چونکہ یہ دیوان منتخب اشعار پر مملو ہیں اسلئے ہر غزل میں تین سے لے کر پانچ اشعار سے زیادہ نہیں ملتے۔ صرف ابتدائی غزل جو "حمد" کی ہے اسمیں گیارہ اشعار ہیں۔

جو لوگ عظیم آباد اسکول کے مدعی ہیں وہ ذرا اس شعر کو بحرؔ کی عینک لگا کر دیکھیں کہ کس اسکول کی نمائندگی کرتا ہے۔

؎ قصد جب "وصل مکرر" پر شب وعدہ ہوا

کس ادا سے بولے وہ ٹھہرو اذاں ہونے کو ہے

دراصل عظیم آباد کا کوئی اسکول نہیں۔ یہاں کے شعرا یا تو دہلی

شعرا کے پیرو رہے یا پھر لکھنوی شعرا کے۔ دیوانچے کے اخیر
میں ایک تقریظ اور چند قطعات طبع ہیں۔ اس کی تفصیل
اس لئے ضروری ہے، کہ کم از کم اس دور کے شعرا کے نام
سے تو کان آشنا ہو جائیں۔

۱۔ تقریظ نثر میں ایک شاعر بلند خیال رشک طغرا و ظہوری
منشی محمد یعقوب صاحب اثر خوشہ چیں خرمن سخن حضرت
خوفی مدظلہ، ان کا ایک شعر بھی ہے جس سے تاریخ طبع
نکالی ہے۔

لب بلبل تو بس وقف نوائے شام ہجراں ہے
ادا صبح قیامت کی ہے سرپا زوں کے نالوں میں

۱۲۹۳ف = ۱۲۹۵ — ۲

۲۔ دوسرا قطعہ تاریخ مرزا احمد علی بیگ کوکب بن مرزا محمد علی
بیگ صاحب بن احمد بیگ طپاں دہلوی کا ہے۔

کوکب از روئے دل سن طبعش
زہے افکار صبغت اللہ گفت

۱۸۸۲+۴ = ۱۸۸۶ع

۳ تیسرا قطعہ محمد قاسم علی خاں قاسم لکھنوی کا ہے۔

سنِ طبع اس کا کہا دل نے قاسم   کہ بیشک فرح بخش جانِ جہاں ہے
۱۳۰۴ھ

دیگر

کلکِ راقم نے اس کا ہجری سال   تین سو ایک ہزار تین لکھا
۱۳۰۴ھ

۴۔ چوتھا قطعہ منشی محمد وزیر صاحب وزیرؔ مہتمم مطبع رپن پریس کلکتہ ۔
دل نے دیکھا جو سال طبع وزیرؔ
طوطیٔ خوش بیانِ فکر لکھا

۵۔ پانچواں قطعہ شیخ عبدالرحیم اثیمؔ عظیم آبادی ۔
ملہم دوم سال طبع اس کا اثیمؔ   سخنِ یادگار سعد افزا
۱۳۰۴ھ

۶۔ چھٹا قطعہ : عبدالرحمٰن خاں قدرتؔ عظیم آبادی ۔
عیسوی سال طبع ہے قدرتؔ + سخن نغز و پاک زیب سواد
۱۸۸۶ء

۷۔ ساتواں قطعہ : شاعر یکتا معانی خیال خواجہ محمد شاہ شہرتؔ عظیم آبادی
کہہ دے شہرتؔ تم اسکے طبع کا سال   گلشن پاک بے خزانِ عقیل
۱۳۰۴ھ

۸۔ آٹھواں قطعہ : خواجہ عبدالعزیز عزیزؔ عظیم آبادی ۔
عزیز اس کا لکھو تم عیسوی سال
چھپا دیوان صفت ما یۂ نور

۱۸۸۶ء

(۱۱)

ارمغانِ احباء

اردو زبان وادب کی ترویج وتہذیب میں مسلمان اور ہندو برابر کے شریک رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم شعراء کے تذکرے جس تن دہی اور فراخ دلی سے لکھے گئے اتنی کوشش ہندو شعراء کے تذکروں کی تدوین میں صرف نہیں کی گئی۔ آج بھی اگر کوشش کی جائے تو سیکڑوں ہی نہیں بلکہ ہزاروں ہندو شعراء ایسے ملیں گے جنہوں نے اردو زبان میں دادِ سخن دی ہے۔ اور ان میں متعدد شعراء صاحبِ دیوان بھی گذرے ہیں۔ انہیں جیسے شعراء میں ایک کا تعارف مقصود ہے۔

ہیرا لال شہرت ولد دیوان ایدل رائے قوم دیس خوجہ کے باشندے تھے جو ضلع بلند شہر میں واقع ہے۔ چودہ سال کی عمر تک کسی ادیب کامل کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور درسی کتابیں پڑھیں۔ دورانِ تعلیم میں شعر کہنے کا شوق ہوا اور اشعار موزوں کرنے لگے۔ پھر طبیعت میں شورش پیدا ہوئی۔

اور دنیا سے دل بیزار ہو گیا۔ کسی اہل دل کی توجہ سے یہ کیفیت جاتی رہی۔ بالآخر بریلی پہنچے اور حاکم ضلع کی عنایت سے ایک ملازمت مل گئی۔ وہاں ہر مشرب و مسلک کے لوگوں سے مراسم دوستانہ رہے اور ایک استاد وقت منشی برمیشور سہائے مسرور سپرنٹنڈنٹ بندوبست کے حلقۂ ارادت میں آکر ذوق سخن کی تکمیل کرنے لگے۔ آٹھ سال تک یہ سلسلہ رہا پھر ہیرالال الور چلے آئے اور یہاں سپرنٹنڈنٹ بندوبست مقرر ہوئے۔ یہاں کے حکمراں مہاراجہ سوائی منگل سنگھ بہادر جی۔ سی۔ اس۔ آئی ان پر مہربان رہے۔ بسلسلہ ملازمت کے باعث پچیس سال تک شعر و شاعری کے شغل سے محرومی رہی۔ پھر احباب کی فرمائش سے گاہے ماہے فکر سخن کر لیتے تھے۔ غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا تو دیکھا کہ اسکی تعداد حضرت عیسیٰ کے لب کی جنبش "قم" کے برابر ہے یعنی ۱۴۰۔ انہی غزلوں کو بنام "ارمغانِ احبا" مطبع نظامی کانپور سے ۱۳۰۴ھ میں شائع کیا۔ یہ تاریخی نام ہے۔ اس میں ۱۴۰ غزلیں اور ۱۲ رباعیاں ہیں۔ ابتدا میں ایک قصیدہ مہاراجہ بہادر الور کی شان میں ہے۔ آخر میں تقاریظ اور قطعات تاریخ طبع دیوان

ہیں۔

پہلی تقریظ اردو میں مولوی سید محمد دلاور علی ظریؔ متوطن ہاپوڑ تحصیل دار راج گڈھ ریاست الور کی ہے۔ دوسری تقریظ زبان فارسی میں سید الشعرا حکیم سید محمد حسن حسنؔ متوطن جانسٹھ مقیم الور کی ہے۔ حکیم صاحب سے صاحب دیوان کا یارانہ تھا۔ انہیں کی فہمائش سے یہ مجموعہ مرتب ہوا۔ حکیم صاحب موصوف سید منور علی خاں آشفتہ دہلی کے فرزند ارجمند تھے۔ جو مومنؔ اور شیفتہ کے شاگرد تھے۔ آشفتہ کا تذکرہ سخن شعراء مصنفہ نساخ میں ملتا ہے۔ ان تقاریظ کے بعد جن لوگوں نے قطعات تاریخ طبع دیوان لکھے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) منشی گوپال کرشن تحسینؔ میر منشی ریاست الور (۲) قاضی محمد امداد علی صاحب جماقیؔ مدرس اول ہائی اسکول الور

(۳) میر کفایت علی علوی ہاپوڑی وکیل عدالت الور

(۴) حکیم محمد عمر فصیحؔ متوطن حال الور

(۵) سید حمید حسین مشتاقؔ متوطن جانسٹھ مقیم الور

(۶) عبد الرحمن خاں شاکرؔ مالک مطبع نظامی کانپور

معیار و میزان (تبصرے)

(۱) مرقع شہاب ڈیمائی سائز کے ۱۶۶ صفحات پر مشتمل ایک دل پذیر مجموعہ غزلیات جناب شہاب الدین رحمت اللہ صاحب حال مقام کراچی کے رشحات قلم کا نتیجہ پہلی بار ۱۹۸۴ء میں کراچی چھپے اور اسکا دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۸۶ء میں منظر شہود پر آیا۔ شہاب صاحب بہار کے ایک نامور فرزند آرہ (شاہ آباد) کے ساکن عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہے۔ عرصہ تک بہار میں پھر مشرقی بنگال (حال بنگلہ دیش) میں رہے سقوط ڈھاکہ کے بعد کراچی چلے گئے اور اب وہاں شاعری اور مصوری کی سحرکاری میں مشغول ہیں۔ فطرت نے ان کو صرف قلم ہی سے نہیں بلکہ موقلم سے بھی نوازا ہے۔ یہ غالب کے تلمیذ شیدائی ہیں۔ تقریباً نصف صدی پہلے غالب کے چند اشعار کا انگریزی ترجمہ تصویر سے مزین شایع کیا ہو اردو شعرا کے منتخب کلام کا ایک آرٹ مجموعہ مصور شایع کیا۔ زیر نظر کتاب حقیقتاً ان کے اشعار کا مرقع ہے۔ اسکی خصوصیت یہ ہے کہ غالب کی غزلوں پر بہ قید قافیہ و ردیف غزلیں لکھی گئی ہیں اور ان غزلوں کے اکثر و بیشتر اشعار کو تصویر کے پیرائے میں

ظاہر کیا گیا ہے۔ طباعت وکتابت کا ایسا مہذب و زیب نمونہ کم ہی دیکھنے
ہی آیا۔ اسکی ترتیب و تہذیب میں جناب شہاب کے جمالیاتی ذوق
کا بھرپور مظاہرہ ہوئے اور کہا جا سکتا ہے کہ کیا باعتبار ظاہری وصباحت
اور کیا باعتبار معنوی خصوصیات یہ مرقع چغتائی کے مرقع غالب کا حریف
غالب ہے۔ فرق ظاہر ہے کہ غالب کے کلام کو چغتائی نے جلوہ کیا
اور اسکو خود مصنف کے اپنے موقلم نے۔ گذارش احوال واقعی کے
عنوان کے مصنف نے اپنے شعری ماحول اور فکری زاویہ نظر کو فکر انگیز
طور پر تحریر کیا ہے۔ پھر جناب فرمان فتح پوری صدر شعبہ اردو کراچی
یونیورسٹی نے اس مرقع پر تحقیقی' در قدرانہ رائے پیش کی ہے وہ اپنی
جگہ اٹل اور ناقابل تردید ہے۔ الغرض یہ مجموعہ غزلیات ایک مرقع
جمیل بر لباس حریر کہا جا سکتا ہے۔ اسکی قیمت ۴۰ روپئے اور مکتبہ
جامعہ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

(۲) **موتی پھول ستارے** | ڈیمائی سائز کے خوب صورت گرد پوش کے ساتھ ۸۰ صفحات
کا ایک دلکش مجموعہ اشعار موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی سے بہتر طباعت
وکتابت کا نمونہ شائع ہوا ہے۔ قیمت دس روپے۔
شاعر کا نام بدیع الزماں خاور ہے۔ گذشتہ شمارہ سفینہ میں ایک

اوران کے وہ اشعار صفحات زمانہ پر مرتسم رہینگے ۔

(۳) **روح ادب**: مغربی بنگال اردو اکادمی کا سہ ماہی ،
جریدہ ہے جس کا پہلا شمارہ ۱۶۰ صفحات کی بڑی تقطیع پر دل پذیر
انداز میں شایع ہوا ہے۔ اگر ایک جلد میں اس کی ظاہری و باطنی خوبیوں
کا اندازہ لگا کر کوئی رائے دی جا سکتی ہے تو یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ حقیقتاً
ادب کی روح کا مجسمہ ہے۔ بنگال کی اردو اکادمی غالباً بھارت کے
صدیوں کی مختلف اکادمیوں سے کمشن ہے۔ اس کمسنی میں اس بلا کی
دل آویزی ہے کہ بے اختیار یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے ؏
خدا ترا ب کم سن درازی من کو کرے

آج بنگال بہار سے الگ ایک صوبہ ہو گیا ہے ورنہ ایک دن وہ تھا کہ
دونوں ایک ہی جسم کے دو ہاتھ، اور ایک ہی چہرے کی دو آنکھیں۔
مرشد آباد و عظیم آباد ایک ہی گھر کے دو آنگن۔ شعرا داو بیا جو مرکز ادب
دہلی سے ترک وطن کر کے کارواں در کارواں رہ پیما ہوئے تو ان کی منزل
عظیم آباد تھا یا مرشد آباد یا پھر آگے بڑھے تو لکھنو۔ اس لئے بنگال و بہار
کا اردو ادب اپنی یکساں تہذیب اور مشترک مزاج رکھتا ہے۔

زیر نظر سہ ماہی رسالہ روح ادب اپنے دامن میں بہتر سے
بلند اور فکر انگیز مضامین کے ساتھ بنگال کی اردو اکادمی کا گزار دیو کا

ایک موثر کالکہ بھی رکھتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ دیگر اکادمیوں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ سفینہ اپنی تنگ دامانی کی وجہ سے اس مجلہ پر سیر حاصل تبصرہ کرنے سے مجبور ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ رسالہ خوب ہے اور خوب تر ہونے کی بشارت دیتا ہے۔ ایسے معیاری رسالے کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کا سالانہ چندہ دس روپے اور فی شمارہ ڈھائی روپے۔ مناسب ہی نہیں بلکہ ارزاں ہے۔ میں اردو کے قدر دانوں سے اس رسالہ کی پذیرائی کی سفارش کرتا ہوں۔

ماہنامہ قوس

بہار ادب خیز ہے مگر زرخیز نہیں۔ ان گنت رسالے نکلتے رہتے ہیں مگر بہت جلد داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ مدیر کا شوق پورے شباب پر ہوتا ہے مگر قارئین کی عدم توجہی سے مرجھا جاتا ہے۔ حمزہ پور شیر گھاٹی (گیا) کا ایک قصبہ ہے وہیں سے "قوس" فروری ۱۹۶۹ء سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ نادک حمزہ پوری اس کے کمانڈر ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کے دلوں کو مسخر کرے گا۔ مقالے، افسانے اور منظومات دل پذیر ہیں۔ مدیر کا شوق اور قارئین کا ذوق دونوں مل کر اسکو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ فی شمارہ -/۲ روپے سالانہ -/۲۰ روپے۔

سفینۂ ادب کا ترجمان

دوماہی

سفینہ

شمارہ (۱۴)

نومبر ——— دسمبر ۱۹۸۴ء

فہرست

مدیر
عطا کاکوی

Rs-3
قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ: محل نو بہار نگ ہاؤس سبزی باغ پٹنہ ۴ ۔ مطبوعہ دی آرٹ پریس پٹنہ ۶

معروضات

سفینہ کا یہ شمارہ ۱۲ جو آپ کے زیر نگاہ ہے۔ تیسرے سال کا آخری رسالہ ہے۔ تین سال کی اس مدت میں سفینہ نے اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہر شمارہ وقت پر نکلتا رہا۔ قارئین نے اسکو سراہا مگر طالبین نے سہارا نہ دیا۔ شاعر کو شعر کی اور مدیر کو رسالہ کی داد ہی ملتی ہے تو اس سے بڑھ کر اسکی قدر و قیمت اور کیا ہوگی۔ مزید اسکا ہوں نہ ہوں طلبگار تو ہیں۔

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم طلب گار پہ احساں میرا

گزشتہ شمارے میں سید ارتضیٰ حسین ہوش عظیم آبادی کی وفات حسرت آیات پہ دو اشک بہائے گئے تھے۔ ابھی وہ آنسو خشک بھی نہ ہونے تھے کہ جناب ادریس سنبھاروی (گیا) کی المناک موت کی خبر خبرنامہ (بہار اردو اکادمی) سے ملی پر معلوم ہوئی مرحوم ایک تجربہ کار صحافی اور اردو ادب کے قدیم خدمت گزار تھے۔ گیا

سے "ندیم" اور "سہیل" ہی دو قدیم ماہنامے قریب قریب ساتھ ساتھ نکلے۔ "ندیم" ایک عرصہ تک ادب کی پرورش کر کے داغ مفارقت دے گیا۔ "سہیل" ساری صحافتی مشکلات کا مقابلہ کرتا رہا اور اب تک اسی آن بان سے نکلتا رہا ہے۔ جناب ادریس مرحوم اپنے آخری دم تک اس کو شائع کرتے رہے۔ سہیل نے متعدد مفید ادبی خصوصی شمارے بھی نکالے جو بہت مقبول ہوئے۔ خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور "سہیل" کو جو مدیر کی یادگار ہے تا دیر قائم رکھے۔

"بہار میں اردو صحافت" پر یوں تو متفرق مضامین وقتاً فوقتاً نکلے مگر کوئی ایسی جامع کتاب مرتب نہ ہو سکی جس سے سارے بہار کی صحافت کا بھرپور جائزہ ملتا۔ شہروں میں تو اخبار اور رسالے نکلے ہی مگر بہار کے اکثر قصبات بھی اس سعادت سے محروم نہ تھے مگر آج بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں۔ کاکو (ضلع گیا) ایک قدیم قصبہ ہے آج سے تقریباً سو سال پہلے یہاں ایک مطبع قائم ہوا اور اخبار بھی جاری ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ قوم کی عدم توجہی سے پروان نہ چڑھ سکا۔ اس قصبے کے ایک رئیس مولوی یوسف حسین تھے جو سر سید تحریک کے ہم نوا اور بستی کے رفاہ عامہ اور تعلیمی ترقی کے علمبردار تھے۔ بڑے

ذہین طبع ۔ مدرسۃ العلوم علی گڈھ ہی کے طرز کا ایک جدید مدرسہ قائم کرنا چاہا ۔ ان کا ارادہ تھا کہ اسکو ایک ایسا ادارہ بنایا جائے تاکہ اطراف وجوانب سے طلبا آکر تعلیم حاصل کریں ۔ اسکے قواعد و ضوابط اور اقامت گاہ کے جملہ مصارف کی تفصیل بھی تابچے کی شکل میں کاکوری کے ایک پریس میں چھپا ان رسالوں کو راقم الحروف نے اپنے لڑکپن میں دیکھا تھا مگر افسوس ہے کہ وہ رسالے محفوظ نہ رہ سکے ۔ اسی مطبع سے ایک اخبار کحل البصر بھی نکلا جس کا کم از کم ایک شمارہ نظر سے گذرا تھا مگر وہ بھی ضائع ہو گیا ۔ معلوم نہیں اسکی مدت حیات کتنی تھی اسی مطبع میں کتابیں بھی چھپیں ۔ ایک کتاب اسی مطبع کی شایع کردہ بنام مکتوبات ابوالعلا۔ راقم الحروف کے پیش نظر ہے ۔ یہ کاکوری پریس میں ۱۳۱۱ھ میں چھپی ۔

حضرت ابوالعلا قدس سرہٗ کا مزار مبارک آگرے میں ہے۔ آپ ہی سے سلسلۂ ابوالعلائیہ جاری ہے ۔ حالات تذکروں میں ملتے ہیں ۔ آپ کے فارسی مکاتیب کا یہ مختصر مجموعہ ۴۷ صفحات پر مشتمل شایع ہوا ۔ اس میں قطعات تاریخ ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۳۱۱ھ میں طبع ہوا ۔

قاضی عبد الودود مرحوم نے عرصہ ہوا ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا
تھا۔ اس کا نام "ادارہ تحقیقات اردو" تھا۔ چند کتابیں بھی اس ادارہ
کے سلسلۂ مطبوعات میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کا ایک عظیم کتب خانہ بھی
انجمن اسلامیہ پٹنہ کے بالائی حصہ میں کرایہ پر قائم کیا گیا تھا جو عرصہ تک
قاضی محمد سعید مرحوم کی نگرانی میں فیض پہنچاتا تھا۔ اسی ادارے کے
اہتمام سے ایک اردو نمائش بھی ہوئی تھی جو اپنی نظیر آپ تھی قلمی کتابیں
جو نمائش میں پیش کی گئی تھیں ان کا تفصیلی جائزہ بھی کتابی شکل میں شائع
ہوا مگر چند ناگزیر حالات کی بنا پر یہ ادارہ معطل رہا۔ اب پھر نئے
سرے سے قاضی صاحب مرحوم کی یادگار کے طور پر اس کا احیا کیا
گیا ہے۔ قاضی صاحب کے صاحب زادے قاضی مسعود صاحب نے
بڑی فراخ دلی سے اپنی کوٹھی کے چند کمرے اس ادارہ کے لئے وقف
کر دیئے ہیں۔ کتب خانہ خدا بخش لائبریری میں منتقل کر دیا گیا ہے
یہ بھی تجویز ہے کہ اس ادارے سے ایک رسالہ بنام "تبصرہ" شائع
کیا جائے۔ یہ اقدام بہت مبارک اور مفید ثابت ہوگا۔

اس شمارے کے ساتھ تذکرۂ گلدستۂ نازنیناں کا تیسرا اور
آخری حصہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ۴۸ صفحات کا یہ تذکرہ مع تعلیقات کے

مکمل ہو گیا قارئین چاہیں تو تینوں اجزا کو سفینہ سے علاحدہ کر کے ایک رسالہ مکمل بنا لے سکتے ہیں یوں بھی یہ رسالہ مکمل طور پر الگ سے فراہم ہو سکتا ہے۔ قیمت ۳۰ روپیہ

۱۹۸۵ء کا پہلا شمارہ کوئی خصوصی نمبر ہوگا۔ گزشتہ روایت بھی یہی رہی ہے سنہ ۱۹۸۲ کی ابتدا فراق و جوشؔ (مشترک) نمبر سے ۱۹۸۳ء کی ابتدا ارشد کاکوی نمبر سے اور ۱۹۸۴ء کی ابتدا کلیم الدین احمد نمبر سے ہوئی تھی۔ اب ۱۹۸۵ء کے شمارہ کا موضوع کیا ہوگا۔ مشورہ تجویز میں ہے —

پہلے بستیاں بنیں پھر قصبے پھر شہر۔ شہروں کے آثار کم و بیش محفوظ ہیں قصبوں کے مٹ گئے یا مٹتے جا رہے ہیں۔ کاکو ایک قدیم تاریخی بستی ہے یہاں بی بی کمال قدس سرہا کا مزار ہے۔ یہ حضرت پیر جگجوت کی بیٹی اور مخدوم شرف الدین بہاری کی حقیقی خالہ ہیں۔ درگاہ اور عیدگاہ فیروز تغلق کے عہد کی یادگاریں ہیں ساٹھ ستر سال پہلے والد ماجد سید شاہ غفور الرحمٰن حمدؔ نے آثار کاکو لکھی تھی۔ اب وہ شائع ہو کر جلد ہی شائقین کے ہاتھوں میں ہوگی۔ اسلاف کے حالات سے جو واقف ہونا نہیں چاہتے وہ گویا یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ آئندہ نسلیں بھی خود ان کے حالات سے ناواقف رہیں۔

یہاں وہاں سے

(۵)

(۳۶) سحابی کی کرامت   حضرت سحابی استرآبادی مشہور صوفی اور رباعی گو ہوئے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۰۱۰ھ ہجری میں ہوا کہا جاتا ہے کہ ستر ہزار رباعیاں کہیں۔ یعنی ایک لاکھ چالیس ہزار اشعار۔ یہ بھی مروی ہے کہ تیس (یا بہ شواہد دیگر چالیس؟) سال تک مسلسل نجف اشرف میں روضۂ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جاروب کشی کی۔ اسباب وغیرہ سے صرف ایک چٹائی اور ایک لوٹا پاس رکھتے۔

ایک بار کہیں جا رہے تھے راستے میں دریا حائل تھا۔ چاہا کہ عبور کریں۔ پاؤں پانی میں چلا گیا۔ سخت تعجب ہوا۔ سوچا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز سے تعلق خاطر باقی ہے۔ وہ چیز سوائے رباعیات کے مجموعہ کے اور کچھ نہ تھی۔ سارا کلام دریا میں غرق کر دیا۔ پھر خراماں خراماں سطح آب پر دریا سے پار ہو گئے چھ سات ہزار رباعیاں جو ادھر ادھر لوگوں کے پاس تھیں وہی سرمایہ بچ گیا۔ یہ روایت سرو آزاد میں بہ

بہ حوالہ مرزا تاریخ صادق منقول ہے۔ غلام علی آزاد بلگرامی
اور معتبر مصنف ہیں۔ اب خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

(۴۷) مظہر جانجاناں کی حسن پرستی مرزا مظہر جانجاناں
صوفی صافی اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اردو میں بھی
اشعار کہتے تھے۔ وہ حسن پسند ہی نہیں حسن پرست بھی تھے۔ انکی
داستانیں مشہور ہیں۔ بندرابن داس خوشگو مصنف تذکرہ
سے یارانہ تھا۔ اکثر وہ خوشگو کے یہاں آتے بے تکلف کھانے
کی فرمائش کرتے، کھا پی کر شب باش بھی ہو جاتے۔ غرض
کہ ان سے گہرے مراسم تھے۔ خوشگو کا بیان ہے کہ مرزا مظہر ایک
جوان رعنا پر فریفتہ تھے۔ کچھ نا چاقی ہوئی تو دنیا سے ایسے
بیزار ہوئے کہ اپنے لئے جیتے جی ایک قبر بنوائی اور اسی میں
رات دن قیام کرتے اور مشہور کر دیا کہ مظہر مر گیا۔ یہ روایت
مرزا مظہر کے ایک رازدار کی ہے۔ اس کو آسانی سے نظر
انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۴۸) خوشگو اور گلشن خود خوشگو بھی کچھ کم عاشق مزاج
نہ تھے۔ بیدل کے تو وہ بڑے
معتقد تھے ہی شاہ سعد اللہ گلشن کے بھی وہ بڑے ارادتمند

تھے۔ شاہ صاحب موصوف اپنے وقت کے ایک صوفی فقیر، دنیا سے بے نیاز ایک مسجد میں اقامت پذیر تھے۔ ان کے کشف و کرامات کے بھی لوگ قائل تھے۔ خوشگو اکثر ان کے یہاں حاضر باش رہتا تھا۔ اسی لئے بے تکلف بھی ہو گیا تھا

ایک بار خوشگو نے شاہ صاحب سے استدعا کی کہ اپنے کشف سے بتائیں کہ اسکو اپنی ایک معشوقہ سے وصال ہو سکے گا یا نہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ خواب میں استخارہ کر کے بتاؤں گا۔ چنانچہ دوسرے دن فرمایا کہ وہ معشوقہ تمہاری قسمت میں نہیں بلکہ ایک دوسرا شخص اس سے متمتع ہوگا۔ اور اس کی شکل و شباہت بھی بتادی۔ بات سچی نکلی اس شکل و شباہت والا آدمی کامیاب رہا اور خوشگو ناکام رہے —— یہ روایت کسی اور سے نہیں بلکہ خود خوشگو نے بیان کی ہے۔ اس لئے ناقابل قبول کیسے سمجھی جائے۔

(۴۹) موسیقی کا اعجاز مسلمانوں نے بھی بجا شا میں شاعری کی ہے۔ سید نظام الدین بلگرامی بڑے موسیقار اور نائک تھے۔ ان کی شاعری کے علاوہ موسیقی کے فن پر چند کتابیں ہیں۔ اپنے وقت کے مشہور ادیبوں میں تھے

اس حیثیت سے ان کو خسرو ثانی کہا جاسکتا ہے۔ وہ مدھ نائک کے لقب سے مشہور تھے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی روایت ہے کہ مولانا میر محمد طفیل بلگرامی فرماتے تھے کہ ایک بار شدت کی گرمی پڑی اور بارش کا نام نہیں حضرت مدھ نائک سے سید محمد فیض بلگرامی نے کہا کہ سنتے ہیں کہ اگلے وقتوں کے نائک میگھ راگ گا کر پانی برسا دیتے تھے حضور بھی اپنا کمال دکھائیں۔ انہوں نے کہا کہ بارش خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کے بس میں نہیں وہ مصر ہوئے تو مدھ نائک بھی راضی ہوئے دھوپ میں بیٹھ کر میگھ راگ الاپنے لگے، تھوڑے ہی دیر میں بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ فیض بلگرامی نے کہا کہ بس زیادہ تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا کمال ظاہر ہوگیا مگر جناب مدھ نائک نے اپنا راگ الاپنا جاری رکھا، پھر تو جل تھل ہوگیا۔ تسخیر فطرت انسان کو ودیعت کی گئی ہے، سخر لکم مافی الارض جمیعا" شاہد ہے۔

(۵۰) فرخ سیر سے نمک حرامی

سید برادران تاریخ ہند میں مشہور ہیں۔ بادشاہ گر گزرے ہیں۔ کتنوں کو تخت پر بٹھا کر فرش پر دے پٹکا۔ انہی بدنصیبوں میں ایک بادشاہ فرخ سیر بھی تھا۔ اگر اس کے اکثر لوگ

[illegible]واہ تھے تو خیر خواہ بھی جب وہ شہید ہوا تو ایک شاعر نے رباعی
[illegible] اس واقعہ کا اظہار کیا ؎

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند صد جور و جفا ز راہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد بجستم فرمود "سادات بوے نمک حرامی کردند"
۱۱۳۱ھ

مشہور ہے کہ یہ رباعی بیدل نے کہی اور سید برادران کے خوف سے دہلی سے فرار ہو گئے پھر جب ان دونوں بھائیوں کا قلع قمع ہو گیا تو واپس آئے اور ۱۱۳۳ھ میں خود بھی وفات پائی۔ اس رباعی کے متعلق قاضی عبدالودود نے تاریخی شواہد کی بنا پر بڑی بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ بیدل کی رباعی نہیں۔ سر دست اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف یہ اطلاع دینی ہے کہ میر عظمت اللہ بے خبر جو بیدل کے ملنے والوں میں تھے اور اس واقعہ سے باخبر بھی ہوں گے مذکورہ بالا رباعی میں نمک حراموں کی پاسداری کی ہے اور فرخ سیر کی شہادت کو واجب قرار دیا ہے وہ رباعی یہ ہے ؎

با شاہ سفیہ آنچہ شاید کردند از دست حکیم ہر چہ آید کردند
بقراط خرد نسخۂ تاریخ نوشت سادات دواش آنچہ باید کردند

(۵۱) اقبال اور رومی | تہذیب الاخلاق (پندرہ روزہ علی گڑھ) کے شمارہ [illegible]

میں شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ کی تصویر کے نیچے تین اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ اشعار کی
نسبت جو شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ سے وابستہ کی گئی ہے وہ حق بجانب ہی
سہی مگر ان اشعار کے نیچے "اقبال" کا اندراج گمراہ کن ہے۔ اگر اصلاح نہ کی
گئی تو آج نہیں تو کل یہ اشعار اقبال کی منظومات میں شامل کر دئے جا
سکتے ہیں۔ یہ اشعار رومی کے ہیں ۔ بنائے رشک کریاغ و گلستانم آرزوست
اسی غزل میں قطعہ بند چند شعر ہیں۔ دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد
شہر الخ ۔ اقبال نے ان اشعار کو اپنی ایک تصنیف میں بطور تضمین درج
کیا ہے۔

(۵۲) **وقت کی بات**   مرزا داغ خاندان لوہارو میں پلے۔
ابھی چار ہی سال کے تھے کہ ان کے والد نواب شمس الدین کو قتل کے
الزام میں پھانسی دی گئی۔ اللہ مسبب الاسباب ہے ان کی والدہ مرزا
فخرو ولی عہد بہادر شاہ کے حبالۂ نکاح میں آگئیں۔ داغ قلعہ معلیٰ میں پروان
چڑھے۔ غدر سے کچھ پہلے مرزا فخرو بھی چل بسے۔ داغ کی خالہ نواب رام پور
سے وابستہ تھیں۔ اسی تعلق سے داغ رام پور پہنچے اور وہاں داروغہ
اصطبل کے عہدے پر ملازم رہے۔ محل کے پروردہ طبیعت خوب سے
خوب تر کی جویاں۔ حیدرآباد کا رخ کیا۔ وہاں والیٔ سلطنت کے دربار
تک رسائی نہ ہو سکی۔ کب تک انتظار کرتے، بے نیل مرام دہلی کا رخ کیا
چاہا کہ اب روحانی فیض حاصل کیا جائے۔ اجمیر شریف پہنچے وہاں ایک

غزل منقبت میں پیش کی ۔

یا خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند غریب نواز

یا کاشف راز خفی و جلی سلطان الہند غریب نواز

اور گڑگڑا کر یہ مقطع پیش کیا ۔ یہ داغ کہاں تک رنج سہے تم سے نہ کہے تو کس سے کہے

تم آل نبی اولاد علی سلطان الہند غریب نواز

ادھر داغ یہ غزل سنا رہے تھے اور وہاں حیدرآباد کی ایک محفل میں جہاں والی سلطنت محبوب علی خان خود موجود تھے ایک طوائف غزل گا رہی تھی جس کا مطلع تھا ۔ سب سے تم اچھے ہو تم سے میری قسمت اچھی

یہی کمبخت دکھا دیتی ہے صورت اچھی

محبوب علی خاں چونکے پوچھا کس کا مطلع ہے ۔ مصاحبوں نے کہا کہ حضور اس بدنصیب کا ہے جو عرصہ تک یہاں تک رہ کر محروم باریابی رہا اور واپس گیا ۔ حکم ہوا کہ داغ کو فوراً طلب کیا جائے ۔ اور ابتدائے آمد حیدرآباد سے اسوقت تک کا معقول مشاہرہ مقرر ہوا ۔ دیگر انعامات و اکرامات کے علاوہ شرف استادی والی سلطنت سے نوازے گئے ۔

(۵۳) ذم کا پہلو آصف الدولہ خود شاعر تھے اور لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے ۔ یہ وہ دور تھا کہ دہلی کے اساتذہ یکے بعد دیگرے لکھنؤ آ کر اپنی شاعری کے جوہر دکھا رہے تھے ۔ اسی زمانے

میں ایک کہنہ مشق شاعر شاہ ملولؔ بھی تھے جو بہت پرگو تھے، اور استادِ وقت سمجھے جاتے تھے۔ ایک بار مشاعرے میں ایک شعر روا روی میں پڑھ گئے ؎

چھٹے عذابِ سے ہجراں کے کاٹئے گردن

کوئی ملولؔ کی اِس دِ لگزار پر مارے

پڑھنے کو تو پڑھ گئے آج کل کا زمانہ ہوتا تو سارا مشاعرہ قہقہہ زار بن جاتا۔ مگر آصف الدولہ کی موجودگی۔ مجمع رومال منہ میں ڈال ڈال کر ہنسی روک رہا ہے۔ خود وزیر الممالک بھی مسکرائے اور شاہ ملولؔ سے مصرع دوئم کی تکرار کی فرمائش کی۔ انہوں نے اس کو داد سمجھا مگر حقیقتاً بیداد تھا۔ ملولؔ نے لہک کر دوسرا مصرع دہرایا "کوئی ملولؔ کی الخ" نواب صاحب نے پھر دہرانے کی فرمائش کی اور وہ پوری کی گئی۔ تب بیچارے ملولؔ کو احساس ہوا کہ اِس شعر میں ذم کا پہلو ہے۔ سخت ملول ہوئے، اس کے بعد تو ایسے شرمندہ ہوئے کہ پھر مشاعروں میں شریک ہونا موقوف کر دیا۔ یہ مصرع زبان زد ہو گیا۔ لونڈوں کی نظر جہاں ملولؔ پر پڑتی یہ مصرع سنا کر ان پر آوازہ کستے۔

"کوئی ملولؔ کی..... الخ"

الفاظ کے استعمال میں بڑے رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہے کہ ذم کا پہلو نہ نکلے اور سماعت مجروح نہ ہو۔ اقبالؔ کی اس دعائیہ نظم "یارب دلِ مسلم الخ" میں بھی ایک مصرع میں ذم کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے اجتناب لازم تھا۔

دو آتشہ

غالب (۸) عطا

گفت آنکہ کب بوی تو از یاد کردی — صبا سے کب کہتے تھے تری بو وہ بھی کیا دن تھے
گل دیدی و در روی ترا یاد کردی — گلوں کو دیکھتے ہی تیرا چہرہ یاد آتا تھا

سیرم نتوان کرد ز دیدار نکویاں — کبھی سیر نہیں ہوتی ہے دیدار حسیناں سے
نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں ہا — نظارہ ترا شبنم، دل ریگ رواں اپنا

سر چشمۂ خون است ز دل تا بہ زباں ہا — مجھکو دیکھو دل سے زباں تک خون کا دریا جاری ہے
دارم سخنے با تو و گفتن نتواں ہا — کہنے کو ہیں پر کہہ نہیں سکتا ہائے غضب باتیں ہیں

مو بر آمد ز کف دست اگر دہقاں را — ممکن ہے کف دست پہ دہقاں کے اگے بال
نیست ممکن کہ کند ریشہ سر از دانۂ ما — ممکن نہیں دانے سے مرے ریشہ بھی پھوٹے

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن — جو آزاد ہیں کفر و دیں سے کیسے ان پر رشک آتا ہے
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن — کافر ہو کر مرنا کیا اور مومن ہو کر جینا کیا

دعوی عشق ز ما کیست کہ باور نہ کند — کس طرح ہو نہ یقیں عشق کے دعوے پہ مرے
می جہد خون دل ما ز رگ گردن ما — خون دل میرا ابلتا ہے رگ گردن سے

غالب

عطا

دراں مقام کہ ساقی قدح بگرداند
چرا سخن رود از خضر و آب حیوانش

جہاں ساقی بدست خاص سبکو جام دیتا ہو
وہاں کیا تذکرہ ہو خضر کا اور آب حیواں کا

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست

اگر غالب نے اپنا خرقہ و مصحف نہیں بیچا
تو پھر کیوں پوچھتا پھرتا ہے مے کی نرخ کتنی ہے

زیستم بے تو و از ننگ نہ کشتم خود را
جاں فدائے تو میا کز تو حیا می آید

ہجر میں زندہ رہا غم میں مر جانا تھا
تجھ سے کیا آنکھ ملاؤں کہ حیا آتی ہے

اگر ہوائے تماشائے گلستاں داری
بیا و عالم در خون تپیدنم بنگر

اگر ہوس ہے گلستاں میں سیر کی تم کو
تو آ کے خوں میں تڑپتا ہوا مجھے دیکھو

شکوہ و شکر ہرزہ و باطل
غالب و دوست آبگینہ و سنگ

شکر بھی ہرزہ شکوہ بھی باطل
دوست اور ہم ہیں آبگینہ و سنگ

سخن سادہ دلم را نہ فریبد غالب
نکتۂ چند ز پیچیدہ بیانی بمن آر

سخن سادہ مرے دل کو کہاں بھاتا ہے
طرز بیدل کی سی پیچیدہ بیانی ہے پسند

قاصد من براہ مردہ و من
ہم چناں در شمارۂ فرسنگ

راہ میں بیچارہ قاصد مر گیا
کر رہا ہوں میں شمار سنگ و میل

تاج پیامی

تخلیق اور تنقید

تخلیق تنقید نہیں۔ اور تنقید تخلیق نہیں۔ دونوں دو مسائل ہیں۔ تخلیقی صلاحیت یا تخلیقی شعور وہبی ہے جبکہ تنقیدی صلاحیت یا تنقیدی شعور کسبی ہے۔

تخلیقی عمل میں نقد و نظر کو قطعی دخل نہیں ہوتا۔ ایک تخلیق کار تخلیق عمل کے وقت نقد و نظر سے قطعی مدد حاصل نہیں کرتا۔ ہاں تخلیق کار فنکار ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی فنکاری کو تنقید سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ اس کی یہ فنکاری اس کی تخلیقی صلاحیت کا ایک جزو موتی ہے۔

ایک تنقید نگار جب کسی تخلیق کی تنقید کرتا ہے تو وہ صرف اس تخلیق کی فنی خوبیوں پر ہی نظر نہیں رکھتا بلکہ وہ تخلیق کار کی حیات و کائنات پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اس کے داخلی اور خارجی عوامل پر بھی۔ اس کے پیش نظر تخلیق کار کی ماضی اور حالیہ زندگی کی تعمیر کے وسائل بھی ہوتے ہیں۔ وہ اس کی نفسیات کی تحلیل نفسی سے بھی کام لیتا ہے اور

عمرانیات کے اثرات کا جائزہ بھی لیتا ہے، یعنی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ تخلیق کار کی شخصیت اور ماحول کو نظر رکھ کر تخلیق پر نقد و تبصرہ کرتا ہے لیکن ایک تخلیق کار ان ساری باتوں سے قطعی الگ ہو کر اپنی تخلیق میں لگا ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق کے وقت اپنی شخصیت اور ماحول سے قطعی غیر متعلق ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر اسے بنانے اور سنوارنے میں مشغول رہتا ہے سنوارنے کو بنانے سے الگ نہیں کر سکتے۔ تخلیق کے سنوارنے کو تنقیدی شعور سمجھنا عظیم غلطی ہے محض ایک ڈھانچہ بنانے کو تخلیق نہیں کہتے بلکہ اس کا سنوارنا، تنظیم و ترتیب یہ ساری چیزیں تخلیقی عمل میں شامل ہیں ایک ہی دور میں کئی ڈرامہ نگار، شاعر، ادیب ہوتے ہیں سبھی ایک درجہ کے نہیں ہوتے۔ ان کے مدارج مختلف ہوتے ہیں۔ اسلئے نہیں کہ ان کا تنقیدی شعور بلند ہوتا ہے بلکہ اسلئے کہ ان کا تخلیقی شعور زیادہ بالیدہ ہوتا ہے۔ بن جونسن (Ben Jonson) اور شکسپیر کی مثال سامنے ہے۔ نقد و نظر میں بن جونسن شکسپیر سے بڑھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے ڈرامے شکسپیر کے عظیم ڈراموں کے سامنے گرد بن کر اڑ گئے۔ کیوں کہ شکسپیر کے اندر کا تخلیق

کاربن جونسن کے اندر کے تخلیق کار سے بڑھ کر تخلیقی شعور رکھتا تھا۔ غالب اور ذوق ایک ہی دور میں پیدا ہوئے۔ ذوق درباری شاعر تھے اور استادِ شاہ بھی تھے۔ اردو الفاظ اور محاوروں کا استعمال وہ غالب سے بہتر جانتے تھے لیکن غالب کے تخلیقی شعور کی رسائی جہاں تک تھی وہاں تک ذوق کی تخلیقی صلاحیت کا پہنچنا محال تھا۔ علم کا جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا ہے غالب کی تخلیقی صلاحیت کے کارنامے سامنے آرہے ہیں۔ اس کا کہنا بجا تھا۔ "میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں"

تخلیق کار کو یہ عظمت اس کی قوت حاسہ، تجربہ و مشاہدہ کی گہرائی، تخئیل کی بلند پروازی، شدت جذبات، غور و فکر کی صلاحیت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہر شخص کو یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں۔ ایک عظیم تخلیق کار ایک عظیم فنکار بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ قوت حاسہ، تخئیل کی بلند پروازی اور غور و فکر کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ہی شعور بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی عظیم تخلیق کو سنوارنا بھی جانتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ کبھی نہیں کہ اس کے اندر تنقیدی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن (Dr. Johnson) بڑا نقاد تھا۔ لیکن ایک گھٹیا درجہ کا تخلیق کار

اقبال ایک عظیم تخلیق کار ہے مگر وہ تنقید نگار قطعی نہیں۔

یہ سمجھنا غلط فہمی ہے کہ اچھے برے کو سمجھنے کی صلاحیت اگر تخلیق کار میں ہو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے اندر تنقیدی شعور بھی ہے۔ اچھے برے کو سمجھنے کی صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھا تخلیق کار ہے۔ ایلیٹ کا کہنا قطعی غلط ہے کہ تخلیق سے تنقید کا وہی رشتہ ہے جو جسم اور سانس میں ہے یہ پر فریب قول ہے۔ جسم کے ساتھ سانس بھی ہوتی ہے اس سے اسے الگ نہیں کر سکتے اسی طرح تخلیق کے ساتھ اس کا حسن بھی ہوتا ہے اسے ہم الگ نہیں کر سکتے۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا لیکن دنیا میں اس وقت بھیجا جب اس نے اس میں سانس ڈالی اور اپنے کو "فتبارک اللہ احسن الخالقین" کہا۔ یعنی سب سے اچھا خالق آج لوگ انسان اور کائنات کو دیکھ کر حیران ہیں۔ کوئی کہتا ہے خدا سب سے بڑا انجینیئر ہے۔ کوئی کہتا ہے خدا سب سے بڑا فن کار ہے۔

تخلیق کار کسی بھی صنف کی تخلیق کرے اس کا بنانا اور سنوارنا اسی کا کام ہے اردو زبان میں بہت سارے شعراء ہیں لیکن ان میں میر، غالب اور اقبال ہی کیوں مشہور اور مقبول ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیت دوسرے شعراء سے بلند رہی ہے

شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد

یہ مقولہ عرصہ سے سنتے آتے تھے مگر اس کی حقیقت کا ذاتی تجربہ بہت بعد کو ہوا۔ اس واقعہ کو بھی تقریباً ساٹھ سال گذر گئے۔ ۱۹۲۴ء میں انٹرنس پاس کرنے کے بعد نیو کالج پٹنہ میں داخلہ لیا یہ نیو کالج، پٹنہ کالج کا ہی ایک بازو تھا جو اس سے کٹ کر پٹنہ کالجیٹ اسکول (جو اس زمانے میں موجودہ لائبریری اور ہوسٹل ہے) میں شامل کر دیا گیا۔ ابتدائی چار کلاس وہاں سے الگ کر دیئے گئے اور دو کلاس انٹرمیڈیٹ کا ملا کر ایک نیا کالج بنا مگر یہ کالج زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ اور پھر قدیم طریقہ پر تعلیمی سلسلہ جاری ہو گیا۔

ہاں تو اس زمانے میں میرے منجھلے بھائی سید شاہ منظور الرحمن اختر کاکوی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں زیر تعلیم تھے میں ان سے اکثر ملاقات کرنے مدرسہ کے دار الاقامہ میں جایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا محمد سہول صاحب صدر مدرس تھے۔ مولانا الملک العلماء ظفیر الدین احمد صاحب (والد ماجد ڈاکٹر مختار الدین آرزو، صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) بھی وہاں کے اساتذہ میں تھے اکثر ملاقات ہو جایا

کرتی تھی۔ انہی دنوں ایک بار دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ جامعہ ملیہ (علی) میں میرے ایک عزیز بھانجے قاضی محمد سعید (برادر قاضی عبد الودود) بار ایٹ لا زیر تعلیم تھے۔ ان سے ملنے گیا۔ جامعہ ملیہ اس وقت میں بالکل ابتدائی حالت ہی میں تھا۔ اور قرول باغ کی کوئی عمارت میں واقع تھا۔ گھومتے پھرتے وہاں کے مختلف شعبوں کو دیکھا۔ لڑکوں کا خود اپنا بینک تھا اور وہ لوگ خود ہی اس کام کو بیشتر انجام دیتے تھے۔ ایک مختصر سا بک ڈپو بھی تھا۔ جو محض ایک کمرے میں واقع تھا جو اب جامعہ بک ڈپو کی شکل میں ہندوستان کا ایک بڑا ادارہ نشر و اشاعت ہو گیا۔ ایک کمرے میں فرش پر ایک باوقار شخص کو بیٹھا دیکھا۔ آپ نے کہا یہ کون ہیں۔ جو بعد میں جاکر ہندوستان کے بے تاج کے بادشاہ یعنی صدر جمہوریت ہند ہوئے۔ یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین جو محض تعلیم یافتہ محض قومی اور ملی جذبے سے اس درسگاہ میں معمولی رقم پر کام کرتے تھے۔ بہر اس چھوٹے سے بک ڈپو میں اتفاقاً نالک دار پر نظر پڑی یہ اقبال کا پہلا مجموعۂ کلام تھا جو ابھی دنوں شائع ہوا تھا۔ لڑکپن ہی سے اقبال کا کلام پڑھتا تھا۔ ان کی جو نظمیں اخبار دل یا رسالوں میں شائع ہوا کی۔ ان کو قلمبند کر لیتا تھا۔ ان کی مختصر نظمیں مثلاً شکوہ جواب شکوہ، ترانۂ ملت طلوع اسلام، تصویر درد خضر راہ نیز شکوہ یک ایجنسی لاہور سے شائع ہوئی تھیں ان سب منگوا کر

پڑھ چکا تھا۔ دل کی خواہش ہوئی کہ اقبال کا یہ پہلا مجموعۂ کلام بانگ درا کو
حاصل کیا جائے۔ اس وقت اسنا ایکڑ پڑ کا رکن موجود نہ تھا۔ تو وہ ڈاکٹر
صاحب موصوف سے استدعا کی کہ بانگ درا کی ایک جلد خرید لا دیجئے
انہوں نے کارکن کو بلوا کر ایک جلد بانگ درا مطبوعہ لاہور جو بڑے
خوبصورت طباعت سے آراستہ تھی منگوا کر مجھے دی۔ اور میں نے
چار روپے اس کی قیمت ادا کرنے والے عمر [illegible] کے ہاتھ میں
دیکر یہ خرید حاصل کیا۔

پھر یہ تو ایک ضمنی بات ہوئی۔ جب دلی سے پٹنہ واپس آیا تو
ایک دن اپنے بھائی صاحب سے ملنے اور ان کو بانگ درا دکھلانے
مدرسہ پہنچا اتفاق کی بات کہ ادھر سے ملک العلماء تشریف لائے
تھے۔ پہنچا تو وہ بھی تھے۔ میرے ہاتھ میں جو کتاب دیکھی تو پوچھا یہ
کون سی کتاب ہے؟ میں نے کہا ڈاکٹر اقبال کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔
ان کو بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ اسلئے کہ یہ کتاب ابھی تازہ اشاعت
پذیر ہوئی تھی۔ اور پٹنہ میں دستیاب نہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے
ایک دن کیلئے یہ کتاب دیکھنے کو مانگی انکار کی گنجائش کہاں تھی۔
کتاب ان کے حوالے کر دی جب کتاب حسب وعدہ واپس آئی
تو دیکھا کہ سبحان اللہ اس کے حاشیوں پر جا بجا پنسل سے کچھ تحریر ملیا

لکھی ہوئی ہیں۔ جیسے کچھ اس قلم کے تھے۔ یہ شعر بہت گستاخانہ ہے۔
اس شعر میں ایک پیغمبر کی شان میں گستاخی ہے۔ یہ کلمہ نازیبا ہے۔ طرز
انداز بیان ہے۔ بڑی شوخی ہے وغیرہ وغیرہ ۔۔

اس نسخہ کی بڑی اہمیت ہو گئی تھی کہ ایک عالم دین ایک شاعر
کے کلام کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اقبال پر ان اعتراضات کا مسئلہ
تو خیر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہے۔ مگر میرے دل نے غیب سے یہ
آواز سنی کہ اقبال فرما رہے ہیں کہ۔

تحسر مرا ہلاک سر کہ برد؟

افسوس کہ یہ نسخہ میرے ایک دوست جنکو کتاب لیکر واپس کرنیکا
مرض بھی لاحق نہیں ہوا لے گئے۔ اور پھر واپس کرنے کا سوال ہی نہ تھا،
اب تو وہ خود موجود نہیں اور نہ کتاب۔ دونوں اللہ کو پیارے
ہوگئے۔ خدا مغفرت کرے۔
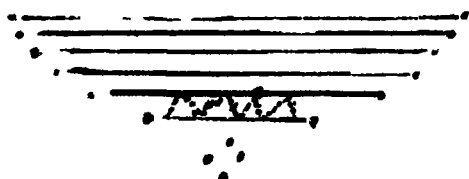
تلفظ کا مسئلہ

(۲)

(۲۳) آستاں، آستانہ

(۱) آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا (غالب)

(۲) اپنی جبیں ہے اور ترا آستانہ ہے۔ (وفا عظیم آبادی)

(۲۴) آشیاں، آشیانہ

(۱) گر تری ہے جنبش یہ گل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو (غالب)

(۲) نیچے جہاں رچائے وہیں آشیانہ ہے (وفا عظیم آبادی)

(۲۵) دامن، داماں

(۱) دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں (درد)

(۲) کہ دامانِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے (غالب)

(۲۶) ماہتاب، مہتاب ماہتاب بر وزن آفتاب، مہتاب بر وزن سرخاب

(۱) ماہ بن ماہتاب بن میں کون (غالب)

(۲) کتان خویش می شویم بہ مہتاب (غالب)

(۲۷) ماہ، مہ

(۱) ماہ بن ماہتاب بن بن گون (غالب)

(۲) حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے (غالب)

(۲۸) گاہ، گہہ

(۱) گاہ میری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود (اقبال)

(۲) گہہ تکلم گہہ تبسم، گہہ تلطف گہ عتاب (سودا)

(۲۹) خانقاہ، خانقہ

(۱) کرشا نقاہ بلی خالی ہیں صوفیوں کے کدو (اقبال)

(۲) خانقہ حضرت یسرا بن بیر (؟)

(۳۰) نگاہ، نگہہ

(۱) دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی (غالب)

(۲) نگہہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینا اسی کا ہے (شاد)

(۳۱) باہم، بہم

(۱) بڑا لطف تھا ملنے جلنے کا باہم (حسرت)

(۲) ہر طول حجاب تک بہم دو انگلیاں تسلسل کا نہیں اٹھتا

(آزاد عظیم آبادی)

(۳۲) **فغاں، افغاں** دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، دوسرے لفظ میں الف کو ساقط کر دیا گیا۔

(۱) کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو (غالب)

(۲) گر وہاں بھی یہ خموشی، تر افغاں ہوگا (مومن)

(مومن نے افغاں کو مذکر باندھا ہے۔ فغاں مونث ہے)

(۳۳) یہاں - یاں

(۱) یہاں تو نشو و نما کا حال نہ کوئی ثمر، ہے لگ و بو کا (شاد)

(۲) یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں (ذوق)

(۳۴) وہاں، واں

(۱) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی (غالب)

(۲) واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں (ذوق)

(۳۵) افسانہ، فسانہ

(۱) رات اندر زلف کا یہ افسانہ (کلیم)

(۲) یہ فسانہ زلف دراز کا سر کا زندگی ہے دوا نہیں (شاد)

(۳۶) طَرح، طَرَح پہلے لفظ میں "ر" ساکن، دوسرے لفظ میں "ر" متحرک دونوں طرح کا تلفظ درست ہے (بمعنی طریقہ)

(۱) دل کو کس طرح سے سمجھاؤں ہے (؟)

(۲) لگا ہیں کتنی ہیں سب راز دل زباں کی طرح (داغ)

(۳۷) خاموشی، خموشی، خامشی اس لفظ کے تین تلفظ ہیں

اور تینوں جائز ہیں۔ خاموشی بروزن مفعولن، خموشی بروزن مفعولن، خامشی بروزن فاعلن

(۱) خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست (؟)

(۲) خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں (غالب)

(۳) دال ایک خامشی تری سب کے جواب میں (ذوق)

(۳۸) ہوشیار، ہشیار

(۱) ہوشیار از عجب دیوانوں نے تدبیر کی (میر)

(۲) ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا (آتش)

(۳۹) ہندوستان ہندستان

(۱) سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا (اقبال)

(۲) رہیں مل جل کے یارب دونوں ہندستاں و پاکستان (؟)

(۴۰) گناہگار، گنہگار

(۱) گناہ اگر نہ کروں تو گناہگار ہوں میں (امیر)

(۲) بخشے جائیں گے گنہگار بہت روزِ جزا (داغ)

(۴۱) کوتاہ، کوتہ

(۱) دست کوتاہ تا سبو نہ گیا (میر)

(۲) دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں (حافظ)

ایک ذرا سی چھاؤں ملی ہے اور ابھی سے یہ عالم ہے (مظہر امام)
بے پہچانے سے لگتے ہیں سارے رشتے ناطے والے

مزاج حسن میں نرمی کا آجانا قیامت ہے (قیوم خضر)
نہ جانے کیوں مرا دل اب ہراساں ہوتا جاتا ہے

چمن اسے اتفاق کہہ لے گری تو ہے آشیاں پہ بجلی (اجتبیٰ رضوی)
نہ دو قدم آشیاں سے پیچھے نہ دو قدم آشیاں سے آگے

دنیا کو شکیل آج بہت ہم سے گلے ہیں (شکیل دسنوی)
دو پھول تبسم کے جو ہونٹوں پہ کھلے ہیں

میں ذوق جستجو میں کہاں تک پہنچ گیا (معصوم شرقی)
حسرت سے دیکھتے ہیں مرے ہمسفر مجھے

جب آنکھ جھپک جائے تصویر بدل جائے (کلیم عاجز)
ہر لمحہ سبک رو ہے ہر جلوہ تنک خو ہے

نفس کو صدر ہے تو ڈھونڈے قرار کی راہیں (شان شمس پوری)
سکوں سے بیٹھ سکے گا نہ اضطراب کبھی

اسلام کے مٹنے کا گماں ہو نہیں سکتا یہ پھول کبھی نذر خزاں ہو نہیں سکتا

ہوئی جو دھوپ تو کچھ اور بڑھ گئی ظلمت (اختر بماکوی)
فضول روتے تھے ہم خندۂ سحر کیلئے (ع۔ک۔)

معیار و میزان (تبصرہ)

علی قلی خاں والہ داغستانی

ڈاکٹر عبدالغفار
انصاری صدر شعبہ فارسی

ٹی۔ این۔ بی کالج بھاگلپور کا یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں ڈیمائی سائز کے ۲۸۴ صفحات پر خود مصنف نے شایع کیا ہے۔ اسکی اشاعت میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش کی مالی امداد شامل ہے۔ قیمت ۵۰ روپے

اس مقالہ میں والہ داغستانی کے احوال و افکار و آثار پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالہ پر مصنف کو ۱۹۶۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ اب پندرہ سال کے بعد یہ مقالہ مطبوعہ شکل میں منصۂ شہود پر آیا ہے۔ والہ داغستانی فارسی صاحب دیوان شاعر بھی تھا اور ایک فارسی تذکرہ شعرا کا مصنف بھی۔ ترکی زبان میں بھی اشعار کہے ہیں اور ایک دو شعر ریختے کے بھی۔

والہ کی زندگی کے احوال بڑے دلچسپ بھی ہیں اور دلدوز بھی۔ اپنی نسبت عم خدیجہ سلطان سے اسکو والہانہ عشق ہو گیا۔ وہ بھی اس پر فریفتہ تھی مگر افسوس کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ ان دونوں

کو صحیح معنوں میں ایران کا لیلیٰ مجنوں کہا گیا ہے اسکے عشق کی منظوم داستان میر شمس الدین فقیر نے لکھی ہے۔

والہ کے کلام میں سوز وگداز کا جو عنصر ہے وہ عشق کی ناکامی کا مظہر ہے۔ والہ وطن چھوڑ کر ہندوستان آیا اور ہجر کی آگ میں جلتا رہا۔ ادھر اسکی معشوقہ کے بہتیرے خواہاں۔ اس کا حسن و جمال اسکے لئے آفت بن گیا۔ لگنوں نے اس پر قبضۂ تصرف جمایا۔ اپنے چوتھے اور آخری شوہر کے مرنے پر اس نے اپنے پرانے عاشق سے ملنے ہندوستان آنے کا قصد کیا۔ راہ ہی میں اسکا انتقال ہو گیا ہے

پروانہ جل کے خاک ہوا شمع رو چکی
تاثیر حسن و عشق جو ہونی تھی ہو چکی ہے

ڈاکٹر عبدالغفار نے بڑی کاوش، جستجو اور دیدہ ریزی سے کام لے کر والہ کی زندگی کے ہر گوشہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور تحقیقی کام کے لئے ایک بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ ماخذوں کو کھنگال ڈالا ہے۔ فہرست کتابیات ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تقریباً دو سو قلمی اور مطبوعہ کتابوں سے معلومات اخذ کئے ہیں اور ان کو سلیقہ سے مختلف ابواب میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ہر طرح قابل ستائش ہے اور مطالعہ کے قابل۔ اور ینٹل بک ڈپو۔ پٹنہ ۴ سے فراہم ہو سکتی ہے

گلدستۂ نازنینان

تالیف

کریم الدین پانی پتی

۱۲۶۱ھ
۱۸۴۵ء

مرتبہ

احمد لیق
عطا کاکوروی

فہرست

..... پیش لفظ

جب میں کریم الدین کے تذکرہ طبقات الشعراء کی تدوین و ترتیب و طباعت سے فارغ ہوا تو خیال تھا کہ اسکے تذکرہ گلدستۂ نازنیناں کی تلخیص بھی شائع کردوں۔ اسکے مطبوعہ نسخے بہت کم یاب ہیں۔ گذشتہ سال لالری صاحب پروفیسر محمود الہی صاحب کے ساتھ پٹنہ تشریف لائے تو عند الملاقات گلدستہ کی بات بھی نکل آئی۔ معلوم ہوا کہ لالری صاحب اس تذکرہ کی مکمل نقل جہاں تک احوال شعرا کا تعلق تھا مرتب کر چکے ہیں۔ انھوں نے ازراہ عنایت عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ میں شائع کرنے کی اجازت دیدی اور ایک مفصل مقدمہ بھی لکھدیا۔ میں ان کا ممنون ہوں۔

کریم الدین لاکھ غیر محتاط سہی پھر بھی اس کے علمی شغف اور تالیفی ذوق کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔ اس نے مختلف موضوعات پر بیسوں کتابیں مرتب کیں اور چھاپیں۔ اس کے مفصل حالات تو آپ کو اس گلدستہ کے مقدمہ ہی سے معلوم ہو جائیں گے۔ میں نے بھی طبقات کے چاروں حصوں میں کریم سے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔ کریم الدین پر اب تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا گرچہ اکثر رسالوں میں اس پر مضامین پائے جاتے ہیں۔ شان احمد صاحب لکچرار ہزاری باغ کالج شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک تحقیقی مقالہ بعنوان — "کریم الدین ـ حیات اور تصانیف" میری نگرانی میں لکھ کر رانچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اگر یہ چھپ جائے تو بہت سے گوشے اجاگر ہو جائیں گے۔

عطا منزل
سلطان گنج پٹنہ ۶

عطا کاکوی

ا ر ستمبر ۱۹۷۲ء ، ۱۲ ر رجب ۱۳۹۲ھ

مقدمہ

مولوی کریم الدین (۱۸۲۱ء - ۱۸۷۹ء) ایک معزز خاندان کے فرد تھے، جسے شاہی جاگیر ملی تھی۔ ان کے دادا پیلی بھیت سے سیر و سیاحت کرتے ہوئے آکر پانی پت میں مقیم ہوئے۔ یہیں کریم الدین کے والد سراج الدین پیدا ہوئے۔ اس کے بعد ان کے دادا نے پانی پت کو ہی اپنا وطن بنا لیا۔ شاہی جاگیر کی وجہ سے معاش کی طرف سے اطمینان تھا۔ لیکن نادر گردی میں بہت سے خاندانوں کی طرح یہ خاندان بھی تباہ و برباد ہوا۔ کریم الدین کے دادا نے قناعت کو اپنا مسلک بنا کر مسجد نشینی اختیار کر لی۔ دادا کی وفات کے بعد انکے والد نے بھی اس روش کو اپنایا۔ وہ مسجد میں نماز پڑھا کر اور لڑکوں کو درس دے کر گزر اوقات کرتے تھے۔ المختصر جب کریم الدین نے آنکھ کھولی تو ان کا خاندان مالی طور پر بالکل تباہ ہو چکا تھا اور اہلِ قصبہ کی مالی اعانت کے سہارے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ ان حالات میں ایک باحوصلہ نوجوان ہی حصولِ علم کی بات سوچ سکتا ہے۔ کریم الدین نے فارسی، عربی اور صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پانی پت میں پڑھیں اور اس کے بعد وہ اپنے علم کی پیاس بجھانے کے لئے شاہجہان آباد آ گئے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال سے بھی کم تھی۔ یہاں دہلی کالج میں داخلہ لینے سے قبل انھوں نے صرف و نحو، معانی و منطق، فلسفہ، طب، فقہ، اصول اور حدیث پڑھی۔ اپنے

حالات زندگی[1] میں انھوں نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ یہ علوم کس سے حاصل کیے۔ لیکن "تاریخ شعرائے عرب" میں مفتی صدرالدین آزردہ سے اپنے تلمذ کا ذکر کیا ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر محمود الٰہی کا خیال ہے کہ "بہت ممکن ہے کہ کریم الدین نے دہلی کالج میں داخلہ لینے سے پہلے "دار البقا"[2] میں داخلہ لیا ہو اور وہاں آزردہ سے استفادہ کیا ہو۔"[3] ان ایام میں کتابت کی اجرت پر ان کی معاش کا انحصار تھا۔

اٹھارہ برس کی عمر میں ۱۸۴۰ء کے قریب کریم الدین دہلی کالج میں داخل ہوئے انھیں سو روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ تعلیم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ پہلے مشرقی شعبے میں داخل ہو کر مشرقی علوم کی تحصیل کی اور اس کے بعد پرنسپل بوترو (Boutros) کے حکم سے مغربی شعبے میں داخلہ لیا اور مغربی علوم سے بھی مستفیض ہوئے۔ وہ کم و بیش چار سال یعنی ۱۸۴۴ء تک دہلی کالج کے طالب علم رہے اور اس دوران میں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے علوم میں خاصی دسترس بہم پہنچائی۔ نصاب کی کتابوں کے علاوہ وہ ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ذریعے ترجمہ کی جانے والی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے رہے اور اس طرح اپنے علم میں برابر اضافہ کرتے رہے۔

---

[1] طبقات شعرائے ہند، ص ۴۶۷ تا ۴۷۳۔

[2] مفتی صدرالدین آزردہ نے عہد شاہجہانی کی مشہور درسگاہ "مدرسہ دار البقا" کو اکبر شاہ ثانی کے عہد میں اپنے انتظام میں لے لیا تھا۔ وہ اس کے اخراجات کے کفیل بھی تھے اور اس میں درس بھی دیتے تھے۔ (خطِ تقدیر، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، ص ۱۲)

[3] خطِ تقدیر، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، ص ۱۲۔

کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولوی کریم الدین نے دہلی میں آباد ہونے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ وہیں شادی کی اور "مطبع رفاہ عام" کے نام سے ایک مطبع حوض قاضی میں قائم کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ انگریزی سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ کرکے اس مطبع سے سستی قیمت پر شائع کریں گے اور اس طرح مغربی علوم و فنون کی ہندوستان میں ترویج و اشاعت کریں گے۔ مگر وہ اس مطبع پر زیادہ عرصے تک قابض نہیں رہ سکے۔ ان کے شرکا نے ان کو دھوکا دے کر اس پر قبضہ کرلیا۔ یہ مطبع زیادہ سے زیادہ ان کے پاس ۱۳ شوال ۱۲۶۱ھ (۱۶ اکتوبر ۱۸۴۵ء) تک رہا۔ امام بخش صہبائی کی کتاب "ترجمہ حدائق البلاغتہ" اور ان کی زیر بحث تالیف "گلدستہ نازنیناں" اسی مطبع سے شائع ہوئیں۔

مطبع کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد کریم الدین تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ دہلی کالج کے پرنسپل اور اردو سوسائٹی کے سکریٹری ڈاکٹر اشپرنگر نے انھیں ترجمے کے کام پر مامور کیا۔ ۱۸۴۵ء لغایت ۱۸۴۸ء انھوں نے کئی موضوعات پر کتابیں ترجمہ و تالیف کیں جن میں "ترجمہ ابوالفدا"، "تاریخ شعرائے عرب" اور "طبقات شعرائے ہند" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ترجمے کے کام سے فرصت پانے کے بعد وہ آگرہ کالج میں پروفیسر رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد وہ پنجاب (لاہور) کے نظامت تعلیمات میں ملازم ہوگئے، اور سررشتہ دار کے عہدے سے ترقی کرکے ڈپٹی انسپکٹر اور پھر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے تک پہنچے۔ ۵۸ سال کی عمر میں انھوں نے ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔

—۲—

اردو تذکرہ نگاروں میں کریم الدین ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنی ادبی زندگی کا آغاز تذکرہ نگاری سے کیا، بلکہ چھ تذکرے بھی لکھے، جن میں سے چار مکمل ہیں اور دو نامکمل۔ کریم الدین کا پہلا تذکرہ "گلدستۂ نازنیناں" ہے، جسے انھوں نے اواخر ۱۸۴۴ء میں لکھا اور انھیں کے مطبع سے یہ ۲۹ر جولائی ۱۸۴۵ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے معاصر شعراء کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لئے انھوں نے اپنے مکان پر مہینے میں دو بار محفل مشاعرہ منعقد کرنے کا اہتمام کیا۔ ان مشاعروں میں جو کلام پڑھا جاتا تھا وہ اسے گلدستۂ مشاعرہ کی صورت میں شائع کرتے رہے۔ مشاعرے کے انعقاد اور گلدستۂ مشاعرہ کی اشاعت کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> "یہ مشاعرہ میرے مکان پر چودھویں تاریخ ماہ رجب ۱۲۶۱ ہجری (اتوار، ۲۰ر جولائی ۱۸۴۵ء) میں شروع ہوا۔ اسی سال میں درمیاں ماہ ذیقعد (نومبر ۱۸۴۵ء) کے بہ سبب بددیانتی اور نااتفاقی شرکاء کے جو مطبع کے شریکوں نے مجھ سے کئے تھے اور میرا مال دبا کر غصب کر مجھ کو بے قبضہ کر دیا تھا، موقوف ہوا۔ جب تک وہ مطبع (رفاہ عام) میرے پاس رہا مشاعرہ پندرہویں روز چھپا۔ تیرہویں ماہ شوال (۱۶ر اکتوبر ۱۸۴۵ء) تک چھپتا رہا۔ ہر مہینے میں دو پرچے نکلا کرتے تھے۔ اس میں ہر ایک شاعر کا حال مع اشعار لکھنے

کا ارادہ تھا تاکہ پچھلوں کے واسطے ایک تذکرہ تیار ہوتا جاوے"۔[1]
لیکن مطبع کے ہاتھ سے نکل جانے کے سبب مشاعرہ اور گلدستۂ مشاعرہ دونوں
ہی بند ہو گئے اور یہ تذکرہ نامکمل رہ گیا۔

کریم الدین کا تیسرا تذکرہ "فرائد الدہر" ہے، جو ڈاکٹر اشپرنگر کی فرمائش پر لکھا گیا۔ یہ عربی شعراء کا تذکرہ ہے اور عربی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس میں باب کی تقسیم صدی کی بنیاد پر کی گئی ہے اور یہ تیرہویں صدی تک کے شعراء کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ۱۸۴۷ء تک یہ تذکرہ لکھا جا چکا تھا، مگر غالباً شائع نہیں ہو سکا۔ اس کے مطالب اور مشمولات کا پتا اس کے ترجمے سے چلتا ہے۔ ان کا چوتھا تذکرہ "تاریخ شعرائے عرب" ہے۔ جو "فرائد الدہر" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی ڈاکٹر اسپرنگر کی فرمائش پر کیا گیا۔ یہ تذکرہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں تیار ہوا اور اسی سال مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہوا۔ ۴۲۸ صفحات کا یہ تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" کے سائز پر چھپا ہے اور ۳۷۴ شعراء کے ذکر پر مشتمل ہے۔[2]

کریم الدین کا سب سے اہم تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" ہے، جس پر ان کی شہرت کا مدار ہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۷ء میں تمام ہوا اور ۱۸۴۸ء میں مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔ تذکرے کے ٹائٹل کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گارساں دتاسی کی "تاریخ ادب ہندوستانی" جلد اول (مطبوعہ ۱۸۳۹ء) کا ترجمہ ہے، لیکن

---

[1] طبقات شعرائے ہند، ص ۴۰۰، ۴۰۱

[2] اس کے تفصیلی جائزے کے لئے دیکھیے، ڈاکٹر محمود الٰہی کا مضمون "اردو میں عربی شعراء کا پہلا تذکرہ" مشمولہ "بازیافت" ص ۱۶۷ تا ۱۸۶۔

حقیقت یہ ہے کہ کریم الدین نے اس میں اس قدر حذف و اضافہ کیا ہے کہ یہ ایک بالکل نئی تالیف ہو گئی ہے۔ خود دتاسی نے اس کا اعتراف کیا ہے:۔

"یہ درحقیقت میری تاریخ کی پہلی جلد سے حذف و اضافہ کے ساتھ تالیف کی گئی ہے، جس سے وہ ایک نئی کتاب ہو گئی ہے اور استفادہ کے لیے کارآمد ہے۔ اضافہ تقریباً تمام کا تمام خاندان تیموری کے شاہزادوں کا ہے جو اپنا وقت بہلانے کے لئے اردو شاعری کیا کرتے تھے یا دہلی کالج کے پروفیسروں کے حالات سے متعلق ہے۔"[1]

ٹائٹل پر مؤلف کی حیثیت سے فیلن کا نام بھی درج ہے۔ بقول دتاسی فیلن نے صرف اس کی "تاریخ ادب ہندوستانی" کا ترجمہ کر کے کریم الدین کے حوالے کر دیا، ورنہ ترتیب و تالیف کا سارا کام کریم الدین نے انجام دیا۔ اسی لئے کتاب کے اندر فیلن کا نام کہیں نہیں ملتا۔ کریم الدین نے جو دیباچہ لکھا ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس تذکرے کی تالیف میں کسی اور کو اپنا شریک و سہیم نہیں سمجھتے تھے۔ ٹائٹل کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۹۶۴ شاعروں کا حال درج ہے، مگر دراصل اس میں ۱۰۰۶ شاعروں دراصل ادیبوں کا ترجمہ شامل ہے۔

کریم الدین کا آخری تذکرہ عربی شعراء سے متعلق تھا۔ اس کی صرف چند قسطیں "پنجابی اخبار" لاہور میں بطور ضمیمہ شائع ہوئیں۔ یہ تذکرہ بھی مکمل نہ ہو سکا۔

---

[1] خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو، ص ۹۶۔

المختصر کریم الدین کے تین تذکرے (گلدستۂ نازنیناں"، "تاریخ شعرائے عرب" اور "طبقات شعرائے ہند"[1] کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ایک تذکرہ (فرائد الدہر) مکمل تو ہوا مگر غالباً شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اور دو نامکمل تذکرے "گلدستۂ شعراء" اور "پنجابی اخبار" کے صفحات تک محدود رہ گئے۔

——۳——

کریم الدین نے اپنا پہلا تذکرہ "گلدستۂ نازنیناں" اس وقت لکھا جب کہ ان کی عمر ۲۳، ۲۴ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ خود ان کی صراحت کے مطابق "گلدستۂ نازنیناں" تذکرے کی اس شاخ سے تعلق رکھتا ہے جسے "انتخاب دواوین" کہا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ گلدستہ اپنے ایک دوست کی فرمائش پر مرتب کیا اور شعراء کے مختصر حالات شامل کر کے اسے تذکرے کی شکل دیدی۔[2] دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ تذکرہ "ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۰ ہجری مطابق دسمبر ۱۸۴۴ء میں تمام ہوا اور ماہ صفر ۱۲۶۱ ہجری مطابق ماہ فروری ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع

---

[1] ڈاکٹر محمود الٰہی، مقالہ "طبقات شعرائے ہند"، مشمولہ "بازیافت"، ص ۳۹۔

[2] یہاں اس حقیقت کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ کریم الدین نے تذکرہ نگاری کا جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں عروض و قافیہ پر مباحث بھی شامل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تذکرہ پڑھنے والے شاعری کے بنیادی تقاضوں سے بھی واقف ہو جائیں۔ اپنے اس ارادے کو انھوں نے عملی جامہ بھی پہنایا اور "گلدستۂ نازنیناں" کے ساتھ "عجالۃ العلالۃ" نامی رسالہ شائع کیا۔ یوں تو "عجالۃ العلالۃ" ایک علیحدہ کتاب ہے، لیکن اسے "گلدستۂ نازنیناں" کا مقدمہ یا اس کا تتمہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ "گلدستۂ نازنیناں" کے دیباچے میں سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے جو کچھ کہا ہے (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ہوا۔" اور خاتمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۲۳ رجب المرجب ۱۲۶۱ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۸۴۵ء کو چھپ کر تیار ہوا۔ لیکن کتاب کے بہ نظر غائر مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۶۱ھ - ۱۸۴۵ء میں بھی اس میں اضافے ہوتے رہے۔ کم از کم بہادر شاہ ظفر، ان کے ولی عہد اور رمز کے کلام کے انتخاب کا اضافہ تو دوران طباعت میں ہوا ہے۔ حکیم مومن خاں مومن اور نواب زین العابدین خاں عارف کے قطعات تاریخ سے بھی اس خیال کی تائید ہوئی ہے کہ اس کے اتمام و اشاعت دونوں کا سال ۱۲۶۱ھ - ۱۸۴۵ء ہے۔ عارف نے "کہو گلدستۂ گلزار جنت" سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔

آغاز کتاب سے پہلے بہادر شاہ ظفر، ان کے ولی عہد اور مرزا محمد سلطان المتخلص بہ رمز کے کلام کا انتخاب بطور تبرک شامل کتاب کیا گیا ہے، جو بیس[۲۰] صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ پہلے حمد و نعت ہے اور پھر وجہ تالیف کے عنوان سے دیباچہ، جس میں کتاب کی غرض و غایت، ماہیت اور تاریخ اتمام و اشاعت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعدہ تاریخ شعراء عربی، فارسی اور اردو شاعری کے ارتقاء کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر تذکرہ شروع ہوتا ہے۔

اس تذکرے میں ۲۷ شعراء اور ۱۰ شاعرات کا ترجمہ شامل ہے۔ حالات زندگی عموماً بے حد مختصر ہیں، لیکن کلام کے انتخابات خاصے طویل ہیں۔ کریم الدین کا اصل مقصد بھی ایک جامع انتخاب ہی فراہم کرنا تھا۔ انتخاب میں صرف غزل کے اشعار ہی نہیں بلکہ قصائد، مثنویات، رباعیات اور مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بعض شعرائے کے کلام پر رائیں

(باقی پچھلے صفحے سالاحظہ فرمایئے) اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ "مجالس العلائۃ" اور "گلدستۂ نازنیناں" کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ تلخیص میں بوجوہ اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

بھی دی گئی ہیں، لیکن ان میں لفاظی اور عبادت آرائی زیادہ ہے اور تنقید کم۔ حکیم مومن خاں مومن اور نواب زین العابدین خاں عارف کے کلام کی تعریف میں انتہائی مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ ایک کی تعریف میں حقِ استادی ادا کیا گیا ہے تو دوسرے کی تعریف میں حقِ دوستی۔

کریم الدین نے اپنے ماخذ کی نشاندہی تو نہیں کی ہے لیکن ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تحقیق کے مطابق "گلدستۂ نازنیناں" کو انھوں نے 'انتخاب دواوین' (مولفہ امام بخش صہبائی) کی مدد سے مرتب کیا ہے..... آغاز شاعری کے متعلق بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ 'انتخاب دواوین' سے ماخوذ ہے۔ یہی نہیں بعض شعرا کے حالات حرف بہ حرف صہبائی کے انتخاب سے نقل کیے گئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ صہبائی نے صرف بارہ ممتاز شاعروں کا انتخاب کلام دیا ہے اور کریم الدین نے تقریباً اڑتیس کا۔"[1]

— ۴ —

کریم الدین تذکرے کو تاریخ کی ایک شاخ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ "طبقاتِ شعرائے ہند" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"کتب تذکرہ اور طبقات چونکہ شاخیں فن تاریخ کی ہیں، اس لیے اکثر اہل علم و فضل نے بلحاظ تکمیل فن تواریخ کی اس فن کی کتابیں ہر ایک زبان مروجہ میں جس کو یہ خیال پیرامونِ خاطر ہوا ہے، تصنیف کی ہیں۔ خصوصاً زبان عرب اور زبان فارسی وغیرہ میں اس قسم کی کتابیں بہت تصنیف ہوئی

---

[1] پاکستان، تذکروں کا تذکرہ نمبر (سالنامہ ۱۹۶۴ء)، ص ۱۷۶۔

ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی زبان اردو میں بھی اس طریق تصنیف کا استعمال کیا گیا۔[۱۵]
یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو تذکرے کو قاموس نگاری کے دور سے نکال کر تاریخ ادب کی حدود میں لا کھڑا کیا۔ یوں تو قائم نے "مخزن نکات" (۱۱۶۸ھ/۱۷۵۵ء) اور میر حسن نے "تذکرۂ شعرائے اردو" (۹۲۔ ۱۱۸۸ھ ۔۔ ۷۸۔۱۷۷۴ء) کو ادوار میں تقسیم کیا تھا، لیکن ان کی یہ کوششیں بڑی حد تک غیر شعوری تھیں۔ سب سے پہلے دتاسی نے اپنی "تاریخ ادب ہندوستانی" جلد اوّل (مطبوعہ ۱۸۳۹ء) کے دیباچے میں اردو شعر و ادب کو تاریخی نقطۂ نظر سے موضوع بحث بنایا۔ لیکن اس نے شعرا اور ادبا، کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے ہی لکھے۔ اسی لئے نام کے باوجود "تاریخ ادب ہندوستانی" ادبی تاریخ نہ بن سکی۔

"طبقات شعرائے ہند" میں کریم الدین کا ماخذ بڑی حد تک دتاسی کی "تاریخ ادب ہندوستانی" ہے، لیکن انھوں نے ہر معاملے میں دتاسی کی پیروی نہیں کی ہے۔ دتاسی کے برعکس انھوں نے شعرا کو ادوار اور طبقات میں تقسیم کرکے ان کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اس خامی کے باوجود کہ کریم الدین نے ہر دور کی ادبی خصوصیات کا جائزہ نہیں لیا ہے اور شعرا کی ادوار میں تقسیم کے سلسلے میں بھی ان سے لغزشیں ہوئی ہیں، اگر انھیں اردو کا پہلا ادبی مورخ اور "طبقات شعرائے ہند" کو ادبی تاریخ کا پہلا نقش کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

"گلدستۂ نازنیناں" میں بھی کریم الدین کا یہ تاریخی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ اردو

---

[۱۵] طبقات شعرائے ہند، دیباچہ، ۱۴۔

شاعری کا جائزہ انھوں نے تاریخی پس منظر میں ہی لیا ہے اور اسے چار طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن یہاں ان کا اصل مقصد تذکرہ لکھنا نہیں بلکہ ایک نیا فن تیار کرنا تھا، اس لئے وہ شعراء کے ترجمے میں تاریخی ترتیب کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔

—— ۵ ——

"گلدستۂ نازنیناں" کے مطبوعہ نسخے کمیاب ہیں، اس لئے اس کی اشاعت ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن سردست اس کی تلخیص کی اشاعت پر قناعت کی جا رہی ہے۔ تاہم تلخیص میں اس بات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مواد قارئین کے سامنے پہنچ سکے۔ شعراء کے تراجم من و عن پیش کیے جا رہے ہیں، صرف مومن کے ترجمے سے ایک طویل عربی عبارت کو حذف کیا گیا ہے۔ نمونۂ کلام کو بھی حذف کر دیا گیا ہے، لیکن اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ شاعر کے کتنے اشعار نمونۂ کلام کے طور پر درج تھے۔ دیباچے سے صرف وہ بیانات حذف کیے گئے ہیں جو عربی اور فارسی شاعروں سے متعلق تھے۔ کتابت کی صریح غلطیوں کی اصلاح کر دی گئی ہے، اور بعض الفاظ جیسے اوس، اون وغیرہ کے املا کو زمانۂ حال کے املا کے مطابق تبدیل کر دیا گیا ہے۔

پروفیسر عطا کاکوی نے کمیاب تذکروں کی اشاعت پر جو توجہ کی ہے، وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ گزشتہ ستمبر میں، میں پٹنہ گیا تھا تو "گلدستۂ نازنیناں" پر ان سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ میں موصوف کا شکر گزار ہوں کہ اس کی تلخیص کرنے کا کام انھوں نے میرے سپرد کیا۔ میں جناب امتیاز علی عرشی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ

انھوں نے اس موضوع پر اپنی لائبریری سے استفادے کا بھرپور موقع دیا اور بعض مفید مشورے بھی دیئے۔

شعبۂ اردو
گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور

احمر لاری
۱۵؍جنوری ۱۹۷۲ء

سبب تالیف

بعد حمد خدا اور نعت رسول مرتضیٰ کے بندہ فقیر حقیر سراپا تقصیر کریم الدین ابن سراج الدین پانی پتی عرض کرتا ہے کہ ایک روز یہ عاجز ایک جگہ شب کو بیچ خدمت ایک دوست کے بہ تقریب ملاقات گیا تھا۔ اس جائے پر ایک اور محب بندہ کے بھی ایک کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے تشریف لائے۔ میں نے ان سے وہ کتاب لے کر جو دیکھی تو ایک بیاض اشعار اردو کی ان کے پاس تھی۔ میں نے استفسار کیا کہ آپ نے اس کو دواوین شعرائے اردو سے شاید کر انتخاب کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا البتہ چونکہ اشعار اساتذہ سے ازبس شوق رہتا ہے، اس لیے ایک بیاض اشعار مرغوبہ کے مرتب کی ہے۔ بندہ نے دو چار شعر اس بیاض سے پڑھ کر دریافت کیا کہ رطب و یابس کی بہت سی بھرتی ہے۔ لیکن بہ سبب تبسم کے وے بھی مافی الضمیر دریافت کر گئے اور اپنے دل میں لیے گئے۔ اس وقت خیال میں اس عاجز کے یہ گزرا کہ اگر تو اپنے نفس پر چند روز محنت گوارا کرے اور سب دیوانوں شعرائے مشہورہ کو جمع کر کے انتخاب ہر قسم کے اشعار کا کرے اور آخر کتاب میں ایک رسالہ بہ زبان اردو علم عروض کا اس طرح کا لکھ کر کہ جس سے ہر طرح کے اشعار اور بحور اور زحافات اور قافیہ اور ردیف اور روی کی شناخت ہو مع امثلہ زبان اردو کے لگا دے تو گویا ایک بیاض عجیب و غریب کہ چشم فلک نے بھی نہ دیکھی ہو، مرتب ہو کر طیار ہو۔ یہ ارادہ دل میں ٹھہرا کر میں نے ان سے کہا کہ حضرت سلامت آپ خاطر جمع رکھیے بندہ ایک بیاض آپ کو

مرتب کر کے نذر کرے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یقین اُس جناب پاک آفریدگار سے یہ ہے کہ حضرت کو تلاش دیوانات اساتذہ مشہورہ کے نہ ہوگی۔ بلکہ اُس بیاض کو اگر تذکرہ فرمایئے تو بجا ہے اور گلدستۂ خورمی نام رکھئے تو سزا ہے اور اگر باغِ ارم کہئے تو بیچ ہے۔ اسی خیال میں مدت مدید اور عرصہ بعید کھنچ گیا۔ وے محب صادق ایک روز غریب خانہ اس عاجز کے تشریف لائے اور فرمایا کہ تو نے اس کی کچھ تدبیر کی۔ میں نے کہا کہ جناب بہ سبب گردشات زمانہ ناہنجار کے شبانہ روز مکروہات زمانہ میں پھنسا رہتا ہوں اور اس انصرام امر کو دو سببوں میں سے کوئی سا سبب ہو تو یہ امر وقوع میں آوے۔ یا تو فراغت بالی کہ کسی طرح کا فکر نہ ہو، یا بموجب فرمائش زبردست کہ اُس کا کہنا ماننا پڑے، کسی طرح نہ ٹال سکے بلکہ اس امر میں اشارہ کرنا اُس کا بمنزلہ حکم واجب الاطاعت اور سعادت اپنی کے مقصود ہو۔ چونکہ وہ دوست نہایت ہی پرلے سرے کے ذکی تھے، سبب ثانی کو سمجھ گئے۔ لیکن چونکہ منظور انتخاب بہ ہیچ کذائی تھا اس لئے وے حتی المقدور والامکان درپے تلاش سبب ثانی کے ہوئے اور بات کو پی گئے، پھر کبھی کچھ تذکرہ نہ کیا۔ اتفاقاً ایک روز وہ دوست تشریف لائے اور فرمایا کہ آج طبیعت چاہتی ہے کہ ہم تم کسی باغ کی سیر کو چلیں۔ بندہ ہمراہ اس کے ہوا۔ جب کہ مکان معہودہ پر پہنچے اور گلِ نسرین و نسترن دیکھنے میں آئے، دیکھا تو فستق پیچاں پھیلا ہوا ہے۔ تب تو اس عاجز نے اس دوست سے عرض کی کہ اے یار حانی

: اے دوست روحانی جیسا کہ تو نے میری طبیعت کو خوش کیا خدا تجھ کو خوش کرے۔

مگر میں چاہتا ہوں کہ اس باغ میں ہر روز ہم تم باہم آکر سیر کیا کریں۔ اس نے کہا کہ بہت اچھا۔ سی طرح عرصہ چار پانچ روز کا گذرا کہ طبیعت اختیار میں نہ رہی اور تاب صبر و شکیبائی کی ناتوانی نے برباد کی۔ آخر کار اُس باغبان گلشن فرحت و آرام جان سے بیدھڑک ملاقات ہوئی

اور مدارات والطاف روز بروز زیادہ ہوئی شروع ہوئی اور فرمائشات اور احکام اس بندہ پر نافذ ہونے لگے۔ جب کہ اس دوست نے خوب جانا کہ سبب ثانی جو یہ بیان کرتا تھا کما حقہ ثابت ہو گیا، تب اس رشک لعبت چین سے کہا کہ اس کو تکلیف تالیف بیاض کی دینی انسب ہے۔ کیونکہ اس میں اپنا بھی مطلب ہے۔ تب اس عاجز نے بموجب حکم المامور من المحب مسرور کے بہ سرعت تمام جس طرح کا انتخاب کہ وہ چاہتا تھا بہ چستی و چالاکی چند روز میں طیار کرکے نذر کیا اور اس کو وسیلۂ نیل مراد کا جان کر اس طرح محظوظ کیا کہ پھولا نہ سمایا۔ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ اس کے چھپ جانے سے بہت فائدہ ہوگا، مناسب ہے کہ یہ بیاض چھپ جائے۔ چنانچہ بموجب اس آرام جاں کے یہ منتخب چھپوایا گیا۔ اس لیے عرض ملاحظہ کنندگان ان اوراق سے یہ ہے کہ اول سے آخر تک جو صاحب ملاحظہ فرمائیں اور کسی جائے کچھ بے ترتیبی یا کوئی شعر ان کے پسند خاطر نہ آئے تو مطعون نہ فرمائیں، کیونکہ محیط ہونا طبیعت واحد کا طبایع تمام بشر پر محال اور غیر ممکن ہے۔ مگر محنت اس عاجز پر غور فرماویں کہ مثالیں علم عروض کی رسالہ میں برمحل اور قابل درج بیاض داخل کی گئی ہیں اور رسالہ مذکورہ حدایق البلاغت اور عروض سیفی اور وافیہ ابن حاجب اور چند اور رسالہ علم عروض کے سے منتخب کرکے بیان تمام مسائل اور بحور اور بیان عروض کا اس طرح پر کہ پھر کسی بڑی کتاب کی حاجت نہ ہو کیا گیا ہے۔ الحمد للہ ذلک حمداً کثیراً کثیراً کہ جس طرح کے انتخاب کو طبیعت خواہش کرتی تھی اسی طرح پر ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۸۴۴ء میں تمام ہوا اور ماہ صفر ۱۲۶۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع ہو گیا اور نام اس کا گلدستۂ نازنیناں رکھا گیا۔ مگر ایک یہ عرض ملاحظہ کنندگان رسالۂ عروض سے ہے کہ اس رسالہ میں اطناب بہ سبب وارد ہونے امثلہ ہر قسم کے شعر کے وقوع میں آیا

ہے۔یعنی مثلاً جس جائے معنی قصیدہ یا بیت یا مخمس یا مسدس یا مثمن وغیرہ کے بیان کئے ہیں، اس جائے بتمامہ وہ لکھ دیا گیا ہے کہ اگر ایک ایک شعر ہر قسم کے شعر کا بطور مثال لکھ دیا جاتا تو البتہ ضخامت اس کتاب کی کچھ کم ہوتی اور اطناب وقوع میں نہ آتا جیسا کہ اب ہے۔ مگر اس کا یہ سبب ہے کہ بندہ نے التزام اس امر کا نہیں کیا ہے کہ انتخاب فقط غزلیات کا کرے بلکہ جس قسم کے شعر اچھے پائے ہیں، وے درج انتخاب کئے گئے ہیں۔ اس لئے بعضے بعضے قصائد مرزا رفیع السودا کے اور ترجیع بند اور ترکیب بند اور مثمن حضرت استاد ملک الشعرا مومن خاں کا کہ قابل درج انتخاب تھے، بتمامہ مندرج کتاب ہوئے۔ فقط اس ہی خیال سے ان کا بتمامہ درج ہونا مناسب ہے ورنہ ایک (شعر) یا بند بھی مثل کو کافی ہوتی ہے۔

..............[1]

....

....

(حال شعرائے اردو)

واضح ہو کہ شعرائے زبان اردو کے بحسب ازمنہ منظوم چار طبقات میں ہو سکتے ہیں۔ طبقہ اول عبارت ان شعرا سے ہے جو کہ متقدمینوں میں سب سے اول شمار کئے جاتے ہیں، مثلاً ولی اور سعدی دکھنی اور شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک متخلص بہ آبرو۔ یہ لوگ الفاظ منکرہ اور محاورات قدیمہ اور روابطات کریہہ کو اکثر استعمال کرتے ہیں، مثلاً نین بجائے

---

[1] بیان شاعر اول، حال شعرائے عرب اور حال شعرائے فارسی کو حذف کر دیا گیا ہے۔ (ا۔ل۔)

آنکھوں کے اور کر بجائے ہاتھ کے اور لفظ ستے اور سوں وغیرہ کے بول چال کو جواز سے سمجھتے تھے۔

طبقۂ دوم میں شاگرد انھیں لوگوں کے تھے۔ لیکن قدم بہ قدم اوائل کے چلا گئے، مگر کچھ کچھ فرق ان کو حاصل تھا، مثلاً حاتم، شہیدی وغیرہ۔ طبقۂ سیوم میں وے لوگ (ہیں) جن لوگوں نے اردو کو اصلاح دی، پاکیزہ پاکیزہ الفاظ اور بہت اچھے اچھے مضامین اور بہت خوب محاورات استعمال کرنے شروع کئے، گویا کہ اردو کو غرا کیا۔ مثلاً مرزا جان جاں مظہر اور میر تقی میر اور سودا اور خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمۃ۔ یہ شاعر استادوں میں سے جو بہت مشہور و معروف دیار ہند میں زبان اردو کے تھے، گزرے۔

طبقۂ چہارم میں وے لوگ پیدا ہوئے جن لوگوں نے اوائل کو بھلا دیا گویا کہ بانیٔ اردو ملا اور مصلح ان کو کہنا چاہیئے اور اس طرح اس فن شاعری کو کمال کے تئیں پہنچایا گویا کہ فن شاعری کو ان لوگوں سے ایک نوع کی جلا و صفا حاصل ہوئی۔ مثلاً حضرت محمد سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ غازی خلد اللہ ملکہ، اور خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق، اور سر آمد فضلا و علما اور حاکم افتا و دین متین استاذی مولوی محمد صدر الدین خاں صاحب بہادر کہ فی زماننا جو ۱۲۶۱ ہجری میں عہدہ صدر الصدوری شاہجہاں آباد پر مامور ہیں، اور حکیم محمد مومن خاں صاحب، اور نواب اسد اللہ خاں المعروف بمرزا نوشہ المتخلص (بہ) غالب و اسد، اور ناسخ اور جرأت اور انشاء اللہ خاں اور نصیر اور مولوی امام بخش المتخلص بہ صہبائی، معروف، سوزؔ، تسکین، نگہت، قاسم، فراق، مصحفی وغیرہ۔ یہ چند اشخاص جو مشہور و معروف دیار ہند کے شاعروں میں ہیں، لکھے گئے۔ والا نہ اگر آدمی چاہے کہ سب کا حال اور سب شعرائے اس زمانہ کا نام بھی درج کرے تو ایک کتاب بجائے خود تیار ہو جائے گی۔ اس لئے ذکر

جم غفیر سے حذر کیا گیا اور اکتفا شعرا ر مشاہیر پر کی۔ یہ تھوڑا سا حال جو یہاں تک بیان ہوا حسب اقتضار مقام لکھا گیا کیونکہ اس عاجز کا ارادہ یوں ہے کہ ایک تواریخ شعرائے ہند کی لکھے۔ ہوالمستعان دباللہ التوفیق۔

خواجہ میر درد

دردؔ تخلص خواجہ میر صاحب نام کا ہے۔ یہ صاحب فرزند لئیق خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص کے تھے۔ مذہب ان کا حنفی، صوفی، شبانہ روز مشغول بحق رہتے اور دنیا داروں کو کبھی کچھ خیال میں نہ لاتے تھے۔ بلکہ بعضے بعضے شخص اُن کی کرامت کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ صاحب ولی اللہ گزرے اور سب فنون حکمیہ اور علم موسیقی اور فن شاعری میں بہت اچھے دست قدرت رکھتے تھے۔ درویش خصلت، گوشہ نشیں متصف بہ زہد و ورع تھے اور بڑے پایہ کے شاعر۔ کلام فصیح صاف وشستہ کہ حاجت بیان کی نہیں رکھتی کیونکہ حال مذاق سخن ان کے کلام سے اہل سخن پر ظاہر ہے کہ کس دھوم دھام کا کلام نجیدہ اور الفاظ پاکیزہ اور مضامین باریک ہوتے ہیں۔ ہر مہینہ کی ۲۴ر تاریخ کو محفل راگ کی ان کے ہاں منعقد ہوا کرتی تھی، چنانچہ ان کے خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ میاں نصیر احمد ہر مہینہ کی ۲۴ر کو بین بجاتے ہیں اور کچھ گاتے بھی ہیں اور محرم کی تیسری کی مرثیہ خوانی بھی اب تک ہوتی ہے۔ چنانچہ سب مرثیہ خواں اس شہر کے وہاں جمع ہوتے ہیں اور اپنی زبان سے مرثیہ ہر ایک شخص پڑھتا ہے۔ فی زمانا حضرت صاحب اُن کے سجادہ نشین ہیں۔ غرضیکہ خواجہ علیہ الرحمتہ نے گیارہ سے نوّے ہجری میں اس دیار دوں سے رحلت فرمائی۔ یہ چند شعر ان کے دیوان سے بطور یادگار انتخاب ہوئے۔ فقط (تعداد اشعار: ۳۰۸)

میر

میر تخلص، افصح فصحا اور ابلغ بلغا اور اشعر شعرائے ہند اور سخنور حال مقام محمد تقی نام کا ہے۔ یہ شاعر خواہرزادہ سراج الدین علی خاں آرزو کا ہے۔ چھ دیوان ریختہ با اصناف سخن منظوم کئے ہوئے اس کے ہیں اور دا سوخت اس شاعر کا بہت مشہور اور معروف ہے۔ ہر چند اقسام شاعری کے سب اصناف پر قادر تھا، لیکن جس قدر غزلیات اس شاعر بے بدل کی شہرت یافتہ ہوئی ہیں، اس قدر قصاید نے پستگی رتبہ حاصل کی۔ دار الخلافہ شاہجہاں آباد میں اولاً ابتدائے حال میں آیا، لیکن بہ سبب برگشتگی طالع کے ناکام و مایوس گیا۔ آخر ایام زیست لکھنؤ میں جا کر بسر کئے اور مایحتاج سرکار نواب وزیر الممالک بہادر سے پایا کیا۔ المختصر لکھنؤ ہی میں راہی ملک عدم داعی اجل کو لبیک اور سعد یک کہتا ہوا دوڑا۔ اور مدح اس شاعر کی جتنی لکھئے کم ہے کیونکہ یہ شاعر ایسے ہی پایہ کا گزرا ہے۔ سب دیوان اس شاعر کے نظر سے گزرے۔ ان میں سے انتخاب غزلیات اور واسوخت کا بتمامہ واسطے حصول فرحت ناظرین گلدستۂ ہٰذا کے لکھا جاتا ہے۔ (تعداد اشعار : ۱۴۲)

سودا

سودا تخلص، مرزا رفیع نام، اصل اور جائے ولادت اس کی شاہجہاں آباد۔ ایام جوانی میں لکھنؤ کو گیا اور وہاں ہی انتقال کیا۔ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ کے مقربین میں سے تھا۔ شعر اس کا بہت خوب ہوتا تھا۔ مگر باب مدح و قدح اس کے سامنے انوری کی عقل کا چراغ بھی گل تھا۔ اس کا نام ہی دلالت کرتا ہے اس

بات کی تصدیق پر کہ کلے کے روبرو چراغ نہیں جلتا۔ طبیعت اس کے کلام سے بہت خوش ہوتی ہے۔ الغرض کہ استاد مسلم الثبوت تھا۔ یہ چند ابیات اس کے دیوان سے انتخاب ہوئیں۔ (تعداد اشعار : ۶۸۵)۔

مومن

شاعر بے نظیر، خاک پا جس کے باب شاعری میں اکثر لعل کان سخنوری بے بہا سخندانی میں گوہر یکتا۔ عالم جمیع اصناف سخن، واقف اسرار فن۔ چشمہ فیض اس کے سے سب دانی و قاصی کامیاب، فنون حکمیہ ادراحوالات سیارات میں گوہر نایاب۔۔۔

. . . .

[1]

. . . .

خاقانی ہر چند کہ زبان فارسی کا زمان متقدم میں گزرا لیکن اگر وہ بھی ہوتا تو جبیں نیاز آستان اس شاعر پر گھستا گھستا مرجاتا، وہ لطافت جو کلام فارسی اس شاعر کے میں ہے ہرگز نہ پاتا۔ کلام اس کے کو اگر سحر کہیں تو بجا ہے، اور اگر افسوں کہیں تو سزا ہے، اور اگر اعجاز کہیں تو سچ ہے۔ حقیقت میں یہ شاعر اسی رتبہ کا ہے۔ میر نے اگرچہ طرز نو اختیار کی پر اس رتبہ کو نہ پہنچ سکا۔ سودا کو گو دعوٰی ہمسری ہر شاعر کا سودا ہوا پر یہاں وہ بھی دیوانہ ہو گیا۔ خاقانی و فیضی و انوری گرچہ فیض خاقان سے منور ہوئے پر ان کے سامنے ان کا بھی چراغ نہ روشن ہوا۔ حکیم اس پایہ کے کہ بو علی سینا اگر تمام عمر قانون طباعت کے

---

[1] یہاں طویل عربی عبارت تھی جسے حذف کر دیا گیا ہے۔ (ا۔ ل۔)

سیکھنے میں گنوائے پیران کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ پائے۔ المختصر موصوف جمیع صفات کمال، اور قادر بر تمام فنون حکمت۔ نام ان کا حکیم محمد مومن خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ قلم میں یہ طاقت کہاں کہ ایک شمہ شمایل شاعر موصوف کا لکھ سکے۔ ناچار تمام اوصاف اس شاعر بے بدل جامع جمیع کمال و فضل کے ذہن مقیم نارسائی کا کر کے قلم انداز کیے جاتے ہیں اور کچھ اشعار ان کے دیوان سے قلم برداشتہ لکھے جاتے ہیں، کیونکہ اس شاعر کا دیوان ہی اس قابل نہیں کہ اس میں سے انتخاب کیا جائے بلکہ سب اشعار درجہ مساوات کا خوبی اور مرغوبی میں رکھتے ہیں۔ (تعداد اشعار: ۲۸۹)

ذوق

ذوق تخلص جناب شیخ محمد ابراہیم دہلوی المخاطب بہ خاقانی ہند کا ہے۔ یہ شاعر فی زماننا ۱۲۶۱ھ میں بڑے رتبہ کا جلیل الشان شاعر ہے اور آمد مضامین برجستہ کے اس قدر اس کو حاصل ہے کہ کسی شاعر کو آج تک نہیں ہوئی۔ حقا کہ یہ شاعر اردو گویوں میں اسی مرتبہ کا ہے کہ جتنا اس کی تعریف میں کہے یا لکھے سو کم ہے، گویا شعر مجسم ہو گیا ہے۔ اکثر اشعار اس شاعر بے نظیر کے دیکھنے میں آئے مگر کوئی شعر ایسا نہ دیکھا کہ اس کا مضمون تازہ اور وہ دلچسپ نہ ہو، جیسا کہ اور شعرا کی غزلوں میں ایسا ہوتا ہے کہ دو چار خوب ہیں تو ایک دو بہ نسبت ان کے اچھے نہیں۔ اور طرفہ تر یہ ہے کہ جو غزل اس کی دیکھنے میں آئی کسی کے ساٹھ[۲۷] شعر کسی کے پچاس کسی کے اٹھائیس[۲۸]۔ اس طرح کا شاعر ہونا بسا مشکل ہے۔ ہم بہت شکر کرتے ہیں خدا کا کہ ہمارے زمانہ میں بھی یکتائے فن ہر ایک فن کے موجود ہیں۔ اب اس زمانہ میں خصوصاً دہلی میں کوئی ان کے مقابلہ کا نہیں

اور اکثر مشاعروں میں اس کی آتش زبانی کے آگے اور شعرا مثل خس و خاشاک کے جلتے ہیں اور اُس کے الفاظ برجستہ کے رشک سے جب کہ وہ محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتا ہے شرمندہ ہو کر بے تابانہ کف افسوس ملتے ہیں۔ تیس برس کے عرصہ سے ملازم درگاہ حالت ولیعہدی سے شہنشاہ دہلی کے ہیں اور فن شعر میں بھی ابتدائے عمر سے معروف ہیں۔ مگر حالت جب سے آج تک یہ عادت متمکن ہو گئی ہے کہ جو شعر کہتے ہیں کسی کو نہیں دیتے۔ لہذا یہ چند اشعار جو ایک بیاض میں تھے بطریق یادگار لکھے جاتے ہیں۔ (تعداد اشعار : ۵۴۹)

جرأت

جرأت تخلص، قلندر بخش نام، سلسلہ اُس کے نسب کا امان محمد شاہ تک پہنچتا ہے جس کو کہ بادشاہ کے جلادوں نے گرفتار کر کے مار ڈالا۔ علم موسیقی میں بھی دست قدرت تھی، مگر ستار نواز خوب تھا اور منجم بھی تھا۔ ابتدائے عمر میں اندھا ہو گیا۔ خوبصورتوں اور گانے والیوں کے ساتھ بہت رہتا تھا۔ ایک مدت ملازم درگاہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر ابن عالم شاہ بادشاہ ہندوستان کے ہاں رہا۔ مصحفی اور انشاء اللہ خاں سے مقابلہ کرتا تھا۔ قریب بیس برس گزرتے ہیں کہ اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ نہایت صنعت کلام تھا اور اکثر اشعار ان معاملات کے کہا جو کہ درمیان عاشق اور معشوق کے ہوتے ہیں۔ طور یادگار یہ چند اشعار اس کے دیوان سے انتخاب کیے۔ (تعداد اشعار : ۳۹۸)

انشار

انشار تخلص، حکیم انشاء اللہ خاں، فرزند ارجمند حکیم ماشاء اللہ خاں مرحوم کا ہے۔ آبا و اجداد اس بزرگ کے شریف زادوں نجف اشرف کے سے ہیں۔ بیچ زمانہ امیر الامراء نواب ذوالفقار الدولہ بہادر کے میر ماشاء اللہ خاں بارو زنجیر فیل ممالک شرقیہ سے وارد حضرت دہلی کے ہوئے۔ یہ شخص بامروت صاحب فتوت اور جواں رو تھا۔ کہتے ہیں کہ ایام حکومت سراج الدولہ وغیرہ حکام بنگالہ کے اٹھارہ زنجیر فیل خانہ میر ماشاء اللہ خاں صاحب کے موجود تھے۔ انھیں ایام میں اتفاق تولد میر انشاء اللہ کا بیچ مرشد آباد کے ہوا۔ یہ شاعر مجملاً بقدر کفایت علوم متعارفہ سے بھی بہرہ اندوز تھا اور فن طبابت میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ طرز گفتار اس کے ساتھ شاعر فصاحت افروز محمد میر سوز کے مشابہت رکھتی ہے۔ مگر دبنگ پن بھی مضامین اس کے سے جن سے روزمرہ اور گفتگو اس شاعر کے ظاہر اور باہر ہوتی ہے، دریافت ہوتا ہے۔ (تعداد اشعار: ۳۷۵)

معروف

تخلص الٰہی بخش خاں معروف خلف الصدق عارف جان کا کہ جو کہ برادر زادہ شرف الدولہ قاسم خاں بہادر سہراب جنگ کا ہے۔ یہ شخص امراء نامدار اور ذوالاقتدار سے ہے۔ بیچ ایام دوست امیر الامراء ذوالفقار الدولہ بہادر کے تھا۔ بہت خدا پرست اور بعبادت و زہد مایل بہ تقوی اور طہارت کا حل اور مرید حضرات چشتیہ سے۔ طبع محتشم اور ذہن سلیم رکھتا ہے۔ اور باپ اور والدہ ماجدہ اور برادران نیک اختران اس والا طبع کے دست بیعت

مولانا فخرالدین علیہ الرحمۃ والغفران سے رکھتے ہیں۔ اور آپ نیاز بیچ خدمت سراپا رفعت
میر ضیاءالدین کے جو کہ ایک خلیفہ راشدین خوب فخرالدین سے ہیں، رکھتا ہے۔ (تعداد
اشعار : ۴۲۱)۔

اسد

اسد تخلص، اسم شریف اُن کا نواب اسد اللہ خاں بہادر، معروف بہ مرزا نوشہ،
خاندان فخیم اور روسائے قدیم اکبرآباد نیک بنیاد کے۔ مدت سے وارد شاہجہان آباد خجستہ
بنیاد کے ہیں۔ ادیب لبیب اس مرتبہ کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی
اس کے حضیض جہل کا مبتلا مشہور۔ سخن فہم و سخن داں اس پایہ پر کہ متنبی و کعب
باوجود تنہا اور بلند پائیگی کے مانند بچوں گھٹنیوں چلنے والوں کے ان کے حضور اشعار
اور مضامین آزادہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری۔ مرجزیے باکانہ اور نثر بے پروایار اس
کے رشک دہ عبارت ظہوری۔ خوان یغما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلہ ربا۔ خاقانی
مستعد بہ سر و پا۔ فیضی سے کیونکر لوگ فیض کو نہ پہنچے جب کہ وہ اس کے ایک
ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں۔ مگر مدت سے فکر ریختہ
گوئی زبان اردو کا ترک کیا۔ مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصانیف نواب
ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا۔ اسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرجہ گلدستہ ہذا کے لیے
گئے۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور
اشعار فارسی میں غالب تخلص رکھتے ہیں۔ چنانکہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور
میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آچکا ہے۔ اس لیے اب فکر اشعار اردو

کا نہیں کرتے۔ (تعداد اشعار : ۱۰۶)

عارف

تخلص نواب زین العابدین خاں بہادر بیٹے نواب غلام حسین خاں بہادر —— خلف الرشید جناب نواب فیض اللہ بیگ سہراب جنگ کے، اور خواہر زادہ اور شاگرد نواب اسداللہ خاں غالب معروف بہ مرزا نوشہ کے۔ روسائے قدیم شاہجہاں آباد نیک بنیاد سے ہے۔ ایام صبا سے شوق اکتساب فنون و اصناف سخن کا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ ہر کلام میں ساحری بھرتے ہیں۔ فہیم و ذکی پایہ کے، عارف حقایق گراں مایہ کے۔ ابتدا میں شوق شعر و سخن جو کرتے تھے تو اصلاح شاہ نصیر سے لیتے تھے۔ لیکن بعد ایک مدت کے جب کہ نواب اسداللہ خاں بہادر وارد شہر ہذا ہوئے نسبت تلمذ بھی ان سے حاصل کی اور طرز و طرح اول کو طرح دی۔ حق یہ ہے کہ اشعار آبدار اور مضامین پاکیزہ جیسے اس شاعر کے ہوتے ہیں ان کی حقیقت اور لطافت سوائے باریک ہیں اور دقیقہ رس آدمیوں کے اور کوئی نہیں پاسکتا۔ اور کیفیت ان کی جس قدر کہ مستولی طبایع سامعین پر ہوتی ہیں سوائے ادراک حواس کے زبان سے کوئی نہیں بتلا سکتا۔ چنانچہ ان روزوں میں اس عاجز کے مکان پر محفل مشاعرہ جو منعقد ہوتی ہے، بعد تمام سننے غزلیات لوگوں کی ان کی غزل خوانی ہوش و حواس اہل مشاعرہ کے کھوتی ہے۔ اکثر بار ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ اہل فضل و کمال سے کوئی مشتاق جو بہ امید استماع غزل ان کی کے آیا ہے۔ اور وہاں اگر غزل کا پڑھ چکنا اگر سن پایا ہے، بیٹھنے بھی نہ پایا ہے کہ بہ ہزار افسوس گھر کو مراجعت کر آیا ہے۔ اور یہی صاحب میر مشاعرہ ہیں۔ غرضکہ دیوان اس منبع صفات ستی اور جامع کمالات

متفرقہ تتری کا جس کو مطلع مہر سعادت کہتے ہیں، تمام دیکھنے میں آیا۔ اگر اس کو رشک گلشن یا ارتنگ مانی کہیے تو حقارت ہے، اگر رشک ارم کہئے تو البتہ عین بصارت ہے۔ دیدہ کو تازگی اور طبیعت کو سرور اور خورسندگی جس قدر اس شاعر بے نظیر کے دیوان کے مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ کسی استاد سلف کے دیوان کے دیکھنے سے نہیں ہوتی۔ اور حالت آمد مضامین کی یہ ہے کہ کوئی شاذ و نادر غزل ایسی ہو گی جو کم تبیس شعر سے ہو گی۔ والانہ پچاس چالیس شعر سے کم نہیں کہتے۔ جب کہ اساتذہ سلف کو یہ رتبہ حاصل ہوا تو اہل زمانہ کس حساب میں۔ یہ بات جو میں نے بیان کی صرف بہ نظر انصاف ہے۔ منکر کو چاہیئے کہ اول سے آخر تک دیوان ان کے بہ نظر انصاف ملاحظہ کرے تب وہ جانے کہ یہ دعویٰ سچ تھا یا غلط۔ سچ تو یہ ہے کہ دیوانات شعرائے متقدمین کے کہ ایک زمانہ مدید اور عرصہ دراز سے مشہور و معروف ہو گئے ہیں، اکثر عوام و خواص مطلع ان کے حال سے ہیں۔ مگر جس روز ان کا دیوان جو کہ ایک گنجینۂ دفینہ ہے مشہور ہو جائے گا اس روز صداقت بندہ کے سارا عالم گواہی دے گا۔ انشاء اللہ وہ دیوان بھی معرض طبع میں آیا چاہتا ہے۔ (تعداد اشعار: ۴۳۲)

آتش

آتش تخلص، خواجہ حیدر علی نام، یہ شاعر شعرائے مشاہیر لکھنؤ سے ہیں۔ اس شاعر کے استاد مسلم الثبوت ہونے میں کچھ شک نہیں۔ چنانچہ بعضے بعضے آدمی وہاں کے یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ شاعر اور ناسخ دونوں ایک رتبہ کے شاعر ہیں۔ پس یہ چند اشعار واسطے ملاحظہ ناظرین گلدستہ ہذا کے دیوان شاعر مذکور سے منتخب ہوئے۔ (تعداد اشعار: ۱۱۴)۔

ناسخ

ناسخ تخلص، شیخ امام بخش نام، لکھنوی۔ تمام عمر لکھنؤ میں بسر کی۔ ایک دفعہ وہاں کے حاکم سے کچھ رنجیدہ ہو کر الٰہ آباد کو چلا گیا، پھر وہاں سے کانپور میں آیا۔ بعد اس کے زمانہ جو موافق ہوا، وطن میں پھر گیا۔ اب دو تین برس ہوئے کہ اس جہان فانی سے طرف عالم جاودانی کے رحلت کی۔ الغرض کہ ناسخ ناسخ تھا شعرائے سلف کا۔ یہ تھوڑے سے شعر اُس کے دیوان سے انتخاب کئے گئے۔ (تعداد اشعار: ۷۰)

مصحفی

٭ تخلص غلام ہمدانی کا ہے۔ اصل اُس کا قصبہ امروہہ من مضافات مراد آباد ہے۔ شروع جوانی میں شاہجہاں آباد کو آیا اور اقامت گزیں ہوا۔ آخر ایام لکھنؤ میں جا کر بسر کیے۔ بڑی عمر پائی۔ ابتدا اس کی انتہا دورۂ سودا کا تھا۔ ہمراہ انشاء اللہ خاں اور جرأت کے اکثر مشاعرہ کیے۔ چھ دیوان ریختہ کے اور دو تذکرہ تصنیف کئے۔ ایک دیوان فارسی اور ایک تذکرہ فارسی لکھا۔ یہ شخص استاد مسلم الثبوت ہے۔ وفات اس کی کو یہ اکتیسواں سال ہے۔ اس کے کلام سے طبیعت بہت خوش ہوتی ہے۔ (تعداد اشعار: ۶۶)

تسکین

تخلص کا اسم شریف ان کا میر حسین ہے، اور سلسلہ ان کے نسبت کا میر حیدر خاں قاتل وزیر فرخ سیر کو پہنچتا ہے۔ فی الواقع یہ صاحب بہت فکر بلند اور طرز گفتار اپنی کے

دل پسند کہتے ہیں، اور مضامین خوب اور الفاظ مرغوب اشعار ان کے سے ہویدا ہیں۔ یہ چند اشعار جو کہ تذکرہ گلشن بے خار میں تھے بطور یادگار واسطے تفریح طبع ملاحظین گلدستہ ہٰذا کے لکھے جاتے ہیں۔ (تعداد اشعار: ۳۷)

شیفتہ

تخلص نواب مصطفےٰ خاں بہادر، خلف الصدق عظیم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ کا ہے۔ یہ صاحب بہت پرگو اور صاحب مذاق اور عقل سلیم اور ذہن فہیم کے ہیں۔ حکیم مومن خاں صاحب سے اصلاح اشعار لی، مگر ان کا دیوان دیکھنے میں نہیں آیا۔ بہرکیف یہ چند اشعار جو کہ ان کے تذکرہ گلشن بے خار میں موجود تھے، لکھے گئے (تعداد اشعار: ۶۴)

ممنون

تخلص، نظام الدین نام، بیٹا قمر الدین منت تخلص کا ہے۔ اس کی اصل سونی پت اور مولد و منشا شاہجہاں آباد۔ کسب فنون اپنے والد بزرگوار سے کیا۔ مدت تک لکھنؤ میں رہا اور ایک زمانہ جرگہ شعرا پایہ تخت حضور والا کے تھا۔ چنانچہ پیشگاہ خلافت سے فخر الشعرا خطاب عطا ہوا۔ من بعد ضلع اجمیر میں پیشگاہ کمپنی بہادر سے عہدہ صدر الصدوری پر ممتاز رہا۔ وفات اُس کی کو تخمیناً عرصہ چار مہینے کا ہوا۔ اس کے کلام کی طرز نہایت دلچسپ اور شیریں ہے۔ غرض کہ گلشن فصاحت کا بلبل ہزار داستان اور گلبن بلاغت کا طوطی شکر فشاں۔ اس واسطے یہ چند اشعار بطور نمونہ کے اس کے دیوان سے

منتخب ہوئے (تعداد اشعار : ۹۸)

قاسم

تخلص حکیم میر قدرت اللہ کا ہے، جو مشہور و معروف مردمان دہلی سے ہیں۔ ایک تذکرہ بطور یادگار اور ایک دیوان چھوڑا۔ ان کی وفات کو یہ پندرہواں برس ہے۔ دیوان ان کا دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ چند اشعار فقط ان کے تذکرہ سے لکھے گئے۔ فقط۔ (تعداد اشعار : ۳۸)

عشق

تخلص حکیم میر عزت اللہ خاں خلف الصدق حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کا ہے۔ اصلاح شعر و سخن کی حکیم ثنار اللہ فراق سے لی اور اپنے والد ماجد سے بھی علم طبابت تحصیل کیا۔ صاحب دیوان ہے، مگر دیکھنے میں نہیں آیا۔ چنانچہ یہ اشعار بطور یادگار تذکرہ حکیم صاحب یعنی والد ماجد ان کے سے لکھے گئے۔ (تعداد اشعار : ۲۲)

ہدایت

تخلص ہدایت خاں، عم ثنار اللہ خاں فراق کا ہے۔ یہ شخص بہت متقی اور پارسا اور نیک گزرے ہیں۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ سے نسبت مریدی کی رکھتے تھے۔ ۱۲۱۵ھ میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی۔ یہ چند اشعار تذکرۂ حکیم قدرت اللہ صاحب سے لکھے گئے۔ حقا کہ یہ شاعر بڑے رتبہ کا ہے۔ (تعداد اشعار : ۶۹)

نصیر

شاہ نصیر، تخلص نصیر، عرف میاں مکو، ولد شاہ غریب، کہ مشاہیر شعراء دہلی تھا۔ بلکہ بہت سے شاعران زبان اردو ساکن دہلی اسی مغفور سے تلمذ ریختہ گوئی کا کرتے تھے۔ اور یہی صاحب عالم حیات میں اپنے تئیں مرزا محمد رفیع سودا اور میر محمد تقی پر فائق سمجھتے تھے۔ بہر کیف ریختہ گوئی میں وسعت قدرت اچھی رکھتے تھے۔ اور آخر عمر میں دہلی سے حیدرآباد دکھن مہاراجہ حاکم وقت راجہ چندو لال کی خدمت میں مشرف ہوئے اور وہیں اس جہان فانی سے رحلت کی۔ یہ چند اشعار بطور یادگار تذکرہ مصنفہ حکیم وافضل المعنی میر قدرت اللہ مرحوم تخلص قاسم سے اور ایک دیوان سے لئے گئے (تعداد اشعار: ۱۴۲)

شمس ولی اللہ

شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعراء دکہن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالم گیر اورنگ زیب کے میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والا ہ نے اس کی قدر دانی کر کے پرورش فرمائی۔ یہ شخص اول شعراء دکہن سے ہے کہ جس نے زبان دکہنی میں ایک دیوان لکھا کر قابل مطالعہ کے ہے۔ اور بعضے کا یہ مذہب ہے کہ زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے۔ (تعداد اشعار: ۶۹)

نظیر

نظیر تخلص شیخ ولی محمد اکبر آبادی کا ہے۔ مکان اس شاعر کا روضہ تاج گنج کے

تنبیہہ

واضح ہو کر ہندوستان میں چونکہ بعضے بعضے عورتیں بھی شاعرہ گزری ہیں، اس لئے مناسب ہوا کہ تمام ہونے اشعار شعرار مذکورہ کے کچھ حال ان کا بھی درج گلدستہ ہذا کیا جائے۔ چنانچہ اس مقام سے ہم اولاً نام ہر ایک عورت شاعرہ کا لکھتے ہیں۔ بعد ازاں اس کے شعر لکھیں گے۔

دولہن بیگم

مشہور نواب بہو، صبیہ رضیہ نواب غفراں مآب انتظام الدولہ خانخاناں مغفور خلف الصدق نواب معلی القاب وزیر الممالک اعتماد الدولہ شہید مبرور کے، زوجہ خاصہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر کی۔ یہ ایک عورت تھی نہایت پارسا، نہایت با تقویٰ۔ باوجود اس حشمت و جاہ اور ملک اور دولت کے، شبانہ روز اپنے معبود کے سامنے لونڈیوں کی مانند حاضر اور اکثر اوقات تلاوت قرآن اور اوراد میں مشغول رہتی تھی۔ یہ دو شعر اسی جناب عفت مآب کے ہیں جو اپنے خاوند کے دو شعر کے جواب میں کہے ہے۔ اس کے خاوند کے دو شعر یہ ہیں .... اس شاعرہ نے یہ دو شعر ان اوّل شعروں کے جواب میں کہے ہیں .... یہ دو شعر بھی اسی مغفورہ و مرحومہ کے ہیں (تعداد اشعار : ۳۰)

جینا بیگم

دختر نیک اختر مرزا بابر مغفور کی، محل خاص شاہزادہ والا تبار مرزا جہاندار شاہ بہادر کی ہیں۔ کبھی کبھی نسبت موزونی طبیعت کے فکر شعر و سخن کرتی تھیں۔ یہ اشعار ان کے ہیں۔ (تعداد اشعار: ۴)

جانی

جانی تخلص، بیگم جان نام، بیٹی نواب قمر الدین خاں مرحوم کی ہیں۔ سنتے ہیں۔ بیگم صاحبہ بہت شدت سے علل و امراض سے دل ریش اور خستہ خاطر تھیں کہ ہمدم نام خواجہ سرا مزاج کی خبر پوچھنے آیا۔ بیگم جان مسبوق الذکر نے یہ مطلع فی البدیہہ پڑھا...

.... یہ شعر بھی اسی شاعرہ کا ہے۔ (تعداد اشعار: ۲)

گنا بیگم

بعضے بیان کرتے ہیں کہ تخلص اس کا منتظر ہے، لیکن یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچی۔ بہرکیف دختر روشن اختر بہشتی علی قلی خاں شش انگشتی کی ہیں، اور محل خاص وزیر الممالک عماد الملک غازی الدین خاں بہادر کی ہیں۔ یہ عورت نہایت جمیلہ اور شکیلہ اور شوخ مزاج، تیز ذہن، ذکی الطبع، خوش فکر، لطیف الوضع، حاضر جواب، بدیہہ گو، حسن المخاطب، کشادہ رو، صاحب جمال، امور دنیاوی میں بڑی دانا، صاحب کمال تھی۔ اکثر اصلاح شعر میر محمد سوز اور کبھی کبھی مرزا محمد رفیع السودا سے بوساطت ملازمین

کے لیتی تھی۔ (تعداد اشعار : ۴۲)

زینت

تخلص ایک معشوقہ بازاری کا ہے۔ اس شہر میں رہتی تھی۔ مگر چونکہ مرزا ابراہیم بیگ پرکرد بھی اس کے ناز کا مفتوں اور مجروح تھا از بس عاشق تھا، اس لئے یہ شہر چھوڑ کر اور حب الوطن اور احباب اور خویش و بیگانہ کو ترک کر کے لکھنؤ کو چلی گئی۔ یہ یہ ایک شعر اس کا بطور یادگار لکھا گیا۔ (تعداد اشعار : ۱)

صاحب

تخلص، نام اس کا امتہ الفاطمہ بیگم، مشہور صاحب جی، شوخ مزاج، آفتاب طبیعت۔ بتقریب ملاقات حکیم محمد مومن خاں سے اتفاق ملاقات اس کے ہوا۔ چند مہینے ملاقات اس سے رہی۔ کئی برس گزرے کہ لکھنؤ کو چلی گئی۔ مثنوی جس کا نام "قول غمیں" ہے، خاں معزی الیہ نے اس محبوبہ کے حق میں لکھی ہے۔ القصہ فیض صحبت اُن کی سے طبع اس کی مائل بہ شعر و سخن ہو گئی تھی اور شعر کہنے لگی تھی۔ یہ بھی ایک کمال خاں موصوف کا ہے کہ ان کی صحبت نے یہ اثر کیا۔ یہ اشعار اُس طلعت ماہ کے بطور یادگار لکھے جاتے ہیں۔ (تعداد اشعار : ۶)

نزاکت

تخلص مہ جمال تمثال، نادر الحسن، بدیع الجمال، جان نواز، دلارام مجو تام،

اصل اس کی بلدہ نارنول ہے۔ بچپن سے جلوہ فرمائے شاہجہاں آباد اور رونق افزائے اس شہر فرخندہ بنیاد کی ہے۔ عجب معشوق ہے، شیریں ادا اور دلبر نمکیں۔ طبع لطیف اس کی بمقتضائے فطرت اور جدت ذہن کی کسب فنون کمال کو مائل اور بہ حسب سرشت اور جبلت کے اوضاع ناپسندیدہ سے متنفر۔ یہ چند شعر بطور یادگار لکھے جاتے ہیں۔ (تعداد اشعار: ۱۴)

دلبر

تخلص ایک معشوقہ جاں نواز، سراپا ناز، پاانداز، مسیح دم، اولو العزم، خورشید ماہ طلعت، سیمیں تن، بلوریں ذقن، نازک اندام، خوش خرام، شیریں کلام، چھوٹی بیگم نام کا ہے۔ قلم میں یہ طاقت کہاں جو ایک شمہ حسن و جمال اور فصاحت قیل و قال دلبر مذکورہ سے لکھے، مگر ان چند اشعار پر زیر حسن پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

طرفہ تر یہ کہ ناز و نعمت کی اپنی جان پر محنت خراشیدگی افکار اختیار کی اور چند روز میں اشعار مثل جوہر آبدار صدف ذہن رسا سے خارج کرنے شروع کئے اور تصحیح و تحقیق الفاظ فارسیہ اور عربیہ کے ہمدموں اور مصاحبوں اپنوں سے کر کے چکنے چکنے الفاظ اور محاورات دلچسپ برتنے شروع کئے۔ اصل باشندہ اکبر آباد کی ہے، لیکن بہت روز ہوئے کہ اب اس کا حال معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ یہ چند شعر جو اس عاجز کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ واسطے نزہت و خورسندگی ملاحظین گلدستہ ہذا کے لکھتا ہے۔ (تعداد اشعار: ۱۰)

جان

تخلص عشقیہ بجاں نواز، رقص ساز، خورشید تمثال، نادرالحسن، بدیع الجمال، خوب رو، خوش کلام، حسن الیتام، صاحب جان نام کا ہے۔ یہ معشوقہ اصل باشندہ فرخ آباد نیک بنیاد کی ہے۔ ایام صبا سے شوق فقط اشعار اساتذہ اور گانے بجانے سار کھتی ہے۔ اور بلکہ طبیعت اس معشوقہ کی اکثر مائل بہ صحبت و ہمدمی اہل نوشت و خواند اور اہل سلیقہ سے رہتی ہے۔ اور گلستان اور بوستاں بلکہ بہار دانش تک تحصیل فارسی بھی اپنے سلیقہ سے کی۔ چنانچہ ایک دوست اس عاجز کے تئیں کہ وہ ہمدم صبح و مسا اس کے رہتے ہیں اور وہ بھی عاشق زار ان کے دم کی ہے۔ ان کی فیض صحبت سے وہ اشعار بھی کہنے لگی، مگر اصلاح بجز ان کے اور کسی سے نہیں لی۔ یہ چند اشعار اس کے جو حسب حال اسی معشوقہ کے ہیں، معرض تحریر میں آئے۔

(تعداد اشعار : ۳)

ماہ

تخلص، ماہ وش، خورفش، معشوقہ شہر آشوب، فتنہ گر، رشک افزائے، لعبت چین و جادو پیکر، وتمثال ماہ کمال، ابرو ہلال، یوسف جمال، زلیخا حصال، چمن حسن میں نونہال۔ کج ادائی اس کی عشاق کے حق میں قہر ذوالجلال۔ خندہ پیشانی، چہرہ نورانی، اوائل جوانی ۵ برس پندہ یا کہ سولہ کا سن ہے جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔ بے فکر و بے غم، باکر و فر ملا زمین و خدم، مشہور منجھلی بیگم۔ قلم میں کہاں طاقت اور زبان

میں کہاں طلاقت جو بیان سراپا اس سراپا حسن و انداز، عشوہ ساز از سرتاپا کا لکھے یا کہے۔ یا پیک وہم و خیال ثانی اس بدر عدیم المثال کو کاری گری قوت وہمیہ سے ذہن میں مرتسم کرے۔ کیا مجال ہے، یہ امر المحال ہے۔ فکر رسا، ذہن سلیم، خیال گرہ کشائے، عقیل فہیم رکھتی ہے۔ سبب سلامت طبع خیال شعر و سخن کرتی ہے، مگر بہ سبب فسق و فجور کے شامت اعمال میں گرفتار رہتی ہے۔ (تعداد اشعار: ۱)

چرکین

تخلص، نام اس شاعر کا معلوم نہیں ہوا۔ ہر چند کہ اشعار ان کے صرف محتوی فحش اور واہیات پر ہوتے ہیں، لیکن اس کی گندگی ضلع کے بولنے اور مضامین واہیات کے باندھنے میں شک نہیں۔ واسطے نزہت اور طرب اور خندیدگی ملاحظین گلدستہ ہذا کے مقام مناسب میں یعنی اخیر کتاب میں لکھے جاتے ہیں۔ (تعداد اشعار: ۱۲۲)

تاریخ اختتام طبع

حکیم محمد مومن خاں مومن	قطعہ اوّل	۹ شعر (اردو)
	قطعہ ثانی	۳ شعر (اردو)
زین العابدین خاں عارف	قطعہ اوّل	۲ شعر (فارسی)
	قطعہ ثانی	۱۲ شعر (اردو)

تمام شد گلدستہ نازنیناں تاریخ بست سیوم رجب المرجب ۱۲۶۱ھ مطابق بست و نہم شہر جولائی ۱۸۴۵ عیسوی کو تالیفات مولوی کریم الدین سے ہے۔ (ختم شد)

تعلیقات

۱۔ درد :- ولادت ۱۱۳۳ھ ۔ وفات ۱۱۹۹ھ (۲۴ صفر یوم جمعہ) ان کے والد عندلیب (م ۱۱۷۲ھ) شاہ گلشن کے مرید تھے۔ درد کے چند فارسی رسالے اور اردو کا مختصر دیوان ہے جس میں غزلیں اور رباعیات ہیں۔ کلام عارفانہ ہوتا ہے اور پُر درد بھی۔ ثنوی کے بھی تقریباً سو اشعار کہے تھے جو انکے بھائی اثر کی ثنوی خواب وخیال میں شامل ہے۔ دیوان کا قدیم ترین نسخہ دہلی کا ہے جو ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ میں چھپا۔ پھر دوسرا نسخہ مطبع محمدی لکھنؤ میں ۱۲۷۱ھ میں باہتمام کپتان مرزا ہندی علی خاں قبول چھپا۔ درد کی وفات کے بعد ان کے بھائی اثر جانشین ہوئے۔ درد کے بیٹے صاحب میر تخلص الم تھے۔

۲۔ میر :- میر آرزو کے خواہرزادے نہ تھے۔ بلکہ میر کے سوتیلے بھائی حافظ حسن آرزو کے حقیقی بھانجے تھے۔ میر کی پیدائش ۱۱۳۵ھ میں ہوئی اور انتقال ۲۰ شعبان روز جمعہ ۱۲۲۵ھ وقت شام نوّے سال کی عمر میں ہوا اور دوسرے دن قبرستان بھیم کے اکھاڑے میں مدفون ہوئے۔ ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی کا پتا چلتا ہے۔ بڑے لڑکے فیض علی، چھوٹے لڑکے میر کلو عرش۔ لڑکی بیگم کہلاتی تھیں۔ جن کی شادی میر کے بھانجے تجلّی پسر کلیم سے ہوئی۔ میر کی تصانیف: نکات الشعرا، فیض میر، ذکر میر، دیوان فارسی، کلیات اردو جس میں چھ دواوین اور چند مثنویاں، رباعیات وغیرہ ہیں۔ میر کا اردو دیوان پہلی بار کلکتہ میں ۱۸۱۰ء میں چھپا۔ میر مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے والد کا نام محمد علی تھا جو علی متقی مشہور تھے اور صوفی صافی بزرگ تھے۔

۳۔ سودا :- سودا کی ولادت کا صحیح سال معلوم نہیں۔ اندازاً ۱۱۱۸ھ تا ۱۱۲۰ھ۔

وفات ۴ رجب ۱۱۹۵ھ۔ اپنے دور کے ممتاز قصیدہ گو اور زبردست شاعر تھے۔ کلیات کے مخطوطے بکثرت ملتے ہیں۔ جن سے ان کی مقبولیت ظاہر ہے۔ ان کے مطبوعہ کلیات میں ان کے شاگردوں کا اکثر کلام خلط ملط ہو گیا ہے اور ان کی بہت سی غزلیں مہربان خاں رند کے دیوان میں شامل ہو گئی ہیں۔ انھوں نے مراثی بھی بہت کہے ہیں۔ حاتم کے شاگردوں کی فہرست میں ان کا بھی نام داخل ہے۔

۴۔ مومن :۔ کریم الدین نے گلدستہ کے دیباچے میں مومن کو اپنے استاد کے لقب سے یاد کیا ہے غالباً اسی بنا پر شاد آنی نے "تحقیقات" میں کریم کو مومن کو شاگرد لکھا ہے۔ کریم نے مومن کے حالات بیان کرنے میں بڑی دریا دلی اور اعتقاد سے کام لیا ہے اور حق شاگردی ادا کیا ہے۔ مومن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا۔ غزل گوئی میں انفرادیت ہے اور حقیقی معنوں میں غالب کے حریف تھے۔ ان کا اردو دیوان ان کی زندگی ہی میں بہت ناقص طور پر چھپا تھا۔

۵۔ ذوق :۔ ایک غریب سپاہی شیخ رمضانی کے بیٹے تھے۔ ۱۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۱ھ میں انتقال ہوا۔ ابتدا میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے پھر ان سے اَن بَن ہو گئی۔ قلعہ معلیٰ میں بادشاہ اور شاہزادوں کے استاد تھے۔ زندگی میں کلام نہ چھپا۔ مرنے کے بعد حافظ ویران وغیرہ نے مل کر دیوان مرتب کر کے ۱۲۷۹ھ میں چھاپا۔ پھر آزاد نے از سرِ نو مرتب کر کے اور کچھ اپنی طرف سے اصلاح و اضافہ کے ساتھ چھاپا۔ دیوان میں قصائد و غزلیات ہیں۔ دیوان کے علاوہ اور کوئی تصنیف نہیں۔

۶۔ جرأت :۔ جرأت کا سالِ وفات ۱۲۲۵ھ نہیں بلکہ ۱۲۲۴ھ صحیح ہے۔ اصلی نام یحییٰ خاں تھا۔ ان کے خاندان کا سلسلہ رائے خاں محمد شاہی سے ملتا ہے۔ جعفر علی

حسرت کے شاگرد تھے۔ جوانی میں نابینا ہوئے غزل گوئی میں معاملات کے مضامین خوب باندھتے تھے۔ ابتدا میں نواب محبت خاں کی رفاقت میں رہے پھر مرزا سلیمان شکوہ سے وابستہ ہوئے۔ ایک مثنوی "حسن وعشق" خواجہ حسن اور بخشی کی واردات عشق سے متعلق لکھی۔

۷۔ انشاؔ :۔ ولادت کا سال صحیح معلوم نہیں مگر قیاساً ۱۱۶۹ھ قرار دیا جا سکتا ہے وفات ۱۲۳۳ھ۔ بلا کے ذہین تھے۔ غالباً اپنے والد ماشاء اللہ ہی سے اصلاح لیتے ہوں گے۔ سعادت علی خاں کے مصاحب بن کر اپنی شاعری اور وقعت دونوں کی مٹی پلید کی۔ بڑی معرکہ آرا طبیعت تھی۔ مصحفی سے ان کا معرکہ یادگار ہے۔ ان کی تصانیف کلیات کے علاوہ دریائے لطافت (بہ شمولیت قتیل)، داستان "رانی کیتکی اور اودے بھان" جس میں عربی یا فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں۔ ان کے خاندانی حالات کے لئے دیکھئے تذکرۂ انیس الاحبا، مرتبہ راقم ص۴۲ و ص۴۳۔

۸۔ معروفؔ :۔ آزاد نے ان کو ذوق کا شاگرد لکھا ہے جو اصلیت نہیں رکھتا۔ معروفؔ، مرزا غالبؔ کے خسر اور فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر کے چھوٹے بھائی تھے۔ آخر میں تارک دنیا ہو گئے اور ۱۲۴۲ھ میں انتقال کیا۔ دو دیوان ریختہ یادگار ہیں۔

۹۔ اسدؔ :۔ ابتدا میں تخلص اسدؔ تھا پھر غالبؔ رکھا۔ ولادت ۱۲۱۲ھ وفات ۱۲۸۵ھ۔ ان کا خود نوشت دیوان ریختہ جو ۱۹ سال کی عمر میں مرتب کیا تھا۔ حال ہی میں برآمد ہوا اور ہندوپاک دونوں جگہ سے شائع ہوا۔ غالبؔ سے متعلق اتنی کثیر کتابیں شائع ہو چکی ہیں کہ مزید اطلاعات ان صفحات میں غیر ضروری ہیں۔

۱۰۔ عارفؔ :۔ ولادت ۱۲۳۲ھ وفات ۱۲۶۸ھ۔ غالبؔ کے خواہر زادے نہ تھے بلکہ ان کی بیوی کے بھانجے تھے۔ غالبؔ نے ان کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ جب یہ مرے تو غالبؔ نے

ان کا پُر درد مرثیہ کہا اور ان کے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو گلے کا ہار بنا لیا۔
عارف کا دیوان غیر مطبوعہ ہے۔

۱۱۔ آتش :۔ سال ولادت معلوم نہیں قیاساً ۱۱۹۲ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دونوں دیوان اپنی زندگی ہی میں شائع کرا چکے تھے۔ (۱۲۶۱ھ) اس کی دوسری اشاعت ان کے انتقال کے بعد ۱۲۶۸ھ میں ہوئی جس میں بقیہ کلام شامل کر دیئے گئے (ملاحظہ ہو راقم کی کتاب تحقیقی مضامین ص ۱۴۷) غزلیات کے علاوہ اور کوئی نمونہ کلام نہیں ملتا۔ قصیدہ اور واسوخت بھی شاید کہا تھا مگر کلیات میں شامل نہیں۔ ۱۲۶۲ھ میں وفات ہوئی۔

۱۲۔ ناسخ :۔ تین دیوان ریختہ ان سے یادگار ہیں۔ دوسرے اور تیسرے دیوان کی غزلیں ملی جلی ہیں۔ وفات ۱۲۵۴ھ میں ہوئی۔

۱۳۔ مصحفی :۔ ولادت غالباً ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ بہت گو تھے۔ وفات ۱۲۴۰ھ میں شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ ان کے دواوین علمی مجلس دہلی سے شائع ہو رہے ہیں۔

۱۴۔ تسکین :۔ درسی کتابیں صہبائی سے پڑھیں۔ پہلے نصیر کے پھر مومن کے شاگرد ہوئے۔ ۱۲۶۸ھ میں رام پور میں وفات پائی۔ انکے بیٹے کا نام میر عبدالرحمٰن آسی تھا۔

۱۵۔ شیفتہ :۔ فارسی میں حسرتی تخلص تھا۔ ولادت ۱۲۲۱ھ۔ وفات ۱۲۸۶ھ۔ صاحب دیوان ہیں۔ تذکرۂ گلشن بے خار ان سے یادگار ہے۔

۱۶۔ ممنون :۔ اپنے وقت کے استاد تھے۔ صاحب دیوان۔ ۱۲۶۰ھ میں وفات پائی۔

۱۷۔ قاسم :۔ مفصل حالات کے لئے دیکھیے راقم کا مرتب کردہ تذکرہ مجموعۂ نغز۔ ولادت قیاساً ۱۱۶۶ھ۔ وفات ۱۲۴۶ھ۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت کے شاگرد اور مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔

113377

۱۸۔ عشق :۔ بہادر شاہ ظفر کے یہ بھی استاد تھے۔

۱۹۔ ہدایت :۔ نام ہدایت اللہ خاں۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ قائم نے ان سے بھی اصلاح لی مگر بعد میں برگشتہ ہو گئے۔

۲۰۔ نصیر :۔ شاہ محمدی مائل سے اصلاح لی جو قائم کے شاگرد تھے۔ ذوق کے استاد تھے مگر آخر میں تعلقات خراب ہو گئے۔ مومن نے بھی اصلاح لی تھی۔ وفات ۱۲۵۴ھ میں ہوئی (چراغ گل)

۲۱۔ ولی :۔ اکثر تذکروں میں نام شاہ ولی اللہ۔ شمس ولی اللہ غلط ہے۔ دہلی غالباً سیاحت کے لئے عہد اورنگ زیب یعنی ۱۱۱۹ھ سے پہلے آئے ہوں گے، شاہ والدہ کا ان کی پرورش کرنا غلط ہے۔ زبان ریختہ کا موجد کہنا بھی غلط ہے۔ ان سے پہلے اور شعراء صاحب دیوان گزرے ہیں۔ وفات کا سال ۱۱۱۹ھ محقق ہے۔

۲۲۔ نظیر :۔ سب شعراء سے ان کا رنگ شاعری جداگانہ ہے۔ باپ کا نام محمد فاروق ۱۲۴۶ھ میں انتقال ہوا۔

۲۳۔ احسان :۔ ۱۲۶۷ھ میں انتقال کیا (سخن شعراء)

۲۴۔ حاتم :۔ ولادت ۱۱۱۱ھ (ظہور) وفات ۱۱۹۷ھ۔ ولی کے شاگرد معنوی ہو سکتے ہیں۔

۲۵۔ نکہت :۔ شاگرد نصیر۔ سکندر نامہ کا ترجمہ بھی کیا۔
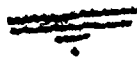
مؤلف کی دیگر کتابیں

تنقید و تحقیق

مطالعۂ شاد -/۴۔ مطالعۂ حسرت ۳/۵۰۔ تقابلی مطالعے -/۳ تنقیدی مطالعے -/۳
تحقیقی مطالعے -/۴ تنقید و تشخیص (ارشد کاکوی) ۵/۵۰

تذکرے

سفینۂ ہندی -/۶ سفینۂ خوشگو -/۸ بیاض الوفاق -/۲ نشتر عشق -/۵ تذکرۂ شورش
تذکرۂ عشقی -/۴ طبقات الشعرائے ہند ۴ حصے -/۱۲ صبح گلشن ۱/۵۰ اشاعۃ الافکار ۱/۵۰
عقد ثریا -/۲ مسرت افزا -/۳ تذکرۂ بے نظیر ۱/۵۰ گلشن و گلزار -/۳ روز روشن
شمع انجمن ۱/۵۰ خوش معرکۂ زیبا -/۵ بزم سخن و طور کلیم -/۳ چمنستان شعرا -/۲
تین تذکرے -/۱۲ انیس الاحبا ۱/۵۰ تذکرۂ میر حسن -/۳ سخن شعرا -/۷ مجموعۂ نغز
گلشن ہند -/۳ گلدستۂ نازنیناں -/۳

منظومات

نذر غالب -/۳ نقشہائے رنگ رنگ -/۳ گلہائے رنگ رنگ -/۴ جمال غزل -/۴ کمال غزل
مآل غزل -/۴ دیوان امین (فارسی) -/۶ حیرت زار (بیدل) -/۴ میخانۂ تغزل -/۴
انتخاب کلام شعرائے بہار ۱/۸۵

نوٹ: ہر موضوع پر اردو کی کتابیں جو دیگر اداروں کی ہیں ہر وقت مل سکتی ہیں۔

ملنے کا پتہ۔ عظیم الشان بک ڈپو، سلطان گنج، پٹنہ ۶